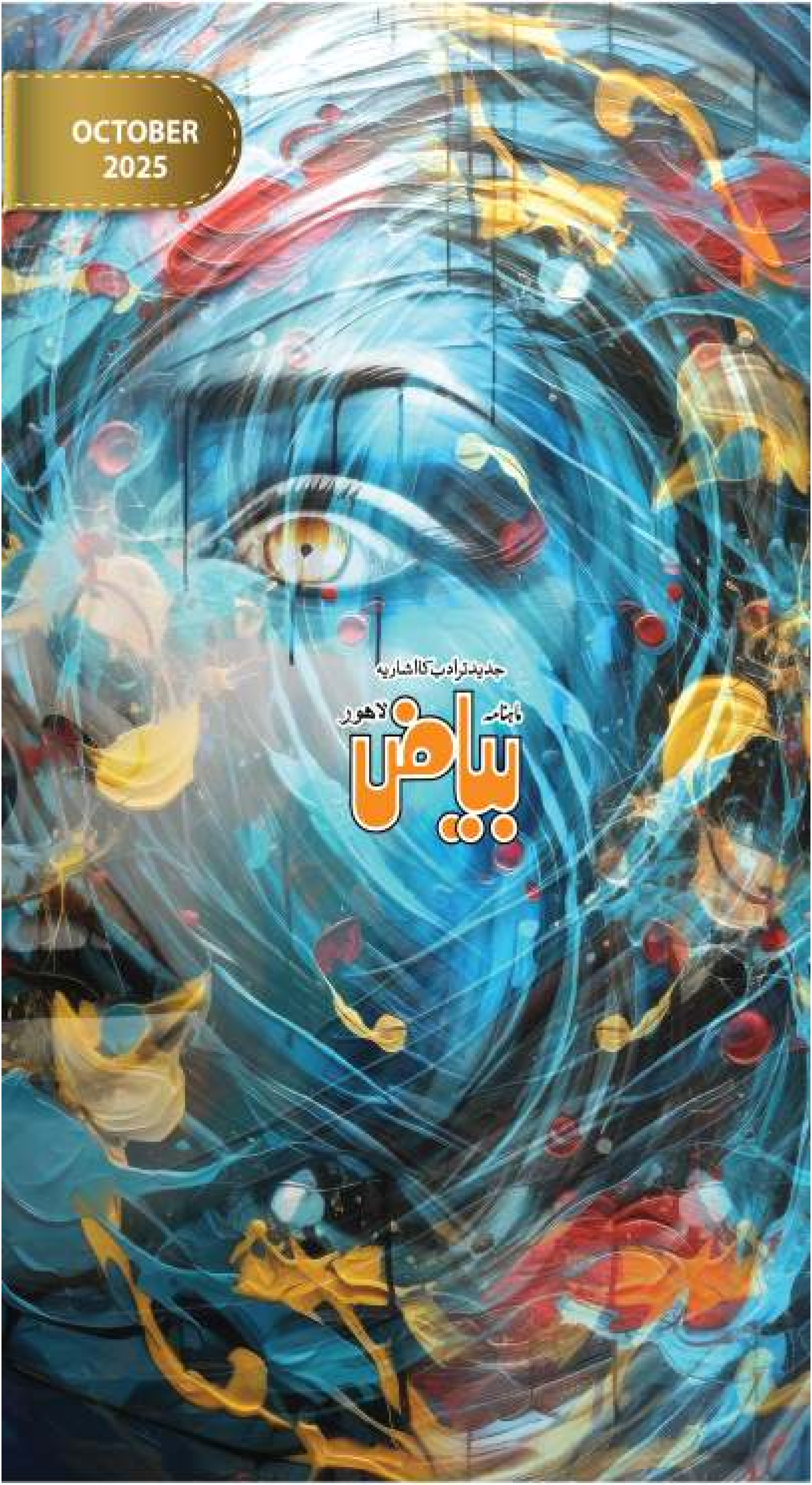

OCTOBER
2025

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

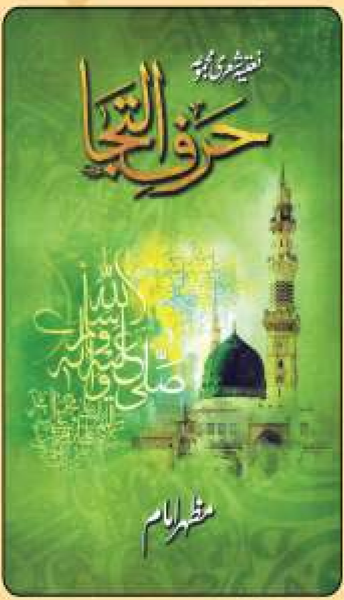
نعتیہ شعری مجموعہ
حرفِ التجا
مظہر امام

آگے ہمارا خواب ہے
جلیل عالی

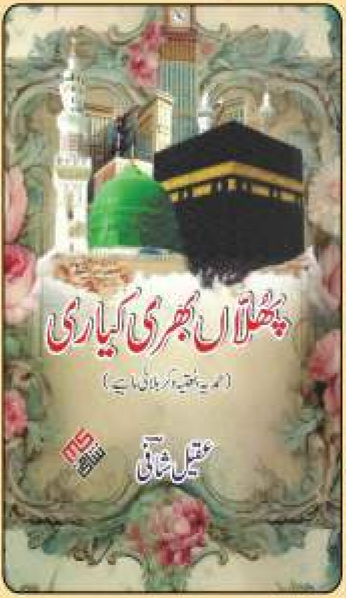
پھلاں بھری کیاری
عقیل شافی

ذوقِ طرحدار
ابنِ حسین

بانی مدیر خالد احمد

غزل

عشق کا فخر نہیں ، یکسر و یکتا ہونا
عشق ہے سب سے الگ ہو کے بھی سب سا ہونا

اپنی آواز تک اب کان نہیں سن پاتے
ایک پل کو بھی میسر نہیں تنہا ہونا

رائے دیں بھی تو کس بات پر کس برتے پر
جب نہ ہونے کے برابر ہو ہمارا ہونا

ڈھنگ آیا ہمیں کب انجمن آرائی کا
ہم کو آ کر بھی نہ آیا سخن آرا ہونا

طاقتِ عشق نہیں ، ممکنتِ فسق نہیں
راس آیا نہ ہمیں حسن شناسا ہونا

قلقلِ فکر نہیں ، ہمہمۂ ذکر نہیں
گلِ کوزہ تھا ، صفِ کوزہ کشاں کا ہونا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37693901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - اکتوبر 2025 - شمارہ نمبر: 10

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران — کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: — قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زاہد فارمیسی نزد اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد انیس انصاری، احمد جلیل، سرور حسین نقشبندی	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، اکرم سحر فارانی، اکرم ناصر، فیض رسول فیضان، منظر اعجاز منظر، سرور حسین نقشبندی، محمد نصیر زندہ، صغیر احمد صغیر، اعجاز رضوی	10 تا 20
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، رضا اللہ حیدر، محمد افضال انجم، مرزا آصف رسول	21 تا 24
4	رباعیات	گلزار بخاری، سعید اشعر	25 تا 26
5	ہائیکو	خاور اعجاز	27
6	ماہیے	بشیر احمد حبیب	28
7	دوہے	سعید اشعر	29
8	افسانے	وسیم جبران، سیدہ آیت گیلانی، سیمیں کرن، محمد شفیق، ماریہ نور، نادیہ عنبر لودھی، طوبیٰ صدیقی	30 تا 56
9	مائکرو فکشن	صہیب اکرام، حامد حسن	57 تا 59

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی منظور ثاقب، گلزار بخاری، راحت سرحدی، شاہنواز زیدی سید افسر ساجد، اکرم ناصر، اقبال سروبہ، احمد جلیل رضا اللہ حیدر، مسعود احمد، صفدر صدیق رضی، قیوم طاہر ابو طالب انیم، اکرم سحر فارانی، رخشندہ نوید، انصر حسن منظر اعجاز منظر، اصغر علی بلوچ، ذکی طارق، فیض رسول فیضان محمد افضال انجم، ساگر حضور پوری، افروز رضوی شگفتہ نعیم ہاشمی، اکمل حنیف، انصر منیر، ظہور چوہان اکرم جاذب، خالدہ انور، سرفراز عارض، علمدار حسین عابد خان عابد، شاہد اشرف، علی رضا، دانش عزیز، اعجاز دانش نائلہ راٹھور، صابر رضا، صغیر احمد صغیر، وسیم جبران، راجہ عبدالقیوم مستحسن جامی، نبیل قیصر، نوید عاجز، عاصم بخاری، جیا قریشی احمد ساقی، قیصر مسعود، سمیع اللہ عرفی، میر اسلم حسین سحر عابد رضا، رؤف ساحر، شہباز خواجہ، سرفراز تبسم، رشا شیخ نوید صادق، اعجاز رضوی	60 تا 120
11	طنز و مزاح خاکہ	محمد ارشاد، علی رضا احمد	121 تا 129
12	مضامین	خاور اعجاز، اسلام عظمی، طارق بٹ، نسیم سحر، فرحت عباس شاہ طاہر شبیر، نثار ترابی، امیر حسین جعفری، افتخار الحق، ظفر اقبال ظفر محمد افتخار شفیع، عامر عباس ناصر اعوان، اسد رضا سحر کومل شہزادی، رانا خالد محمود قیصر، قمر زمان، فیصل فارقلیط احسان اللہ طاہر، اعجاز رضوی	130 تا 214
13	غم ورثہ ہے ناولٹ	دردانہ نوشین خان	215 تا 222
14	نظمیں	جلیل عالی، نسیم سحر، سید افسر ساجد، غلام حسین ساجد فیاض تحسین، انوار انجم، رخشندہ نوید، وسیم جبران، امجد بابر سید طاہر شیرازی، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، عمران شاہد نائلہ راٹھور، حنا بابر چوہدری، محمد ارزم، توصیف خواجہ کشمالہ گیلانی، اعجاز رضوی	223 تا 241

حمد

آسمانوں سے اُترتے ہیں تری حمد کے لفظ
کتنے پاکیزہ ہیں، پیارے ہیں تری حمد کے لفظ

جب بھی کھولنے لگتا ہوں میں مجموعۂ حمد
پھول بن بن کے مہکتے ہیں تری حمد کے لفظ

میں تری حمد کا رہرو ہی نہیں تھا مرے رب!
راستہ مجھ کو دکھاتے ہیں تری حمد کے لفظ

یہی پڑھنا بھی سکھاتے ہیں مجھے، لکھنا بھی
میری تدریس کو آتے ہیں تری حمد کے لفظ

اور کچھ بھی نہیں، بس اتنی خبر ہے مجھ کو
میرے اندر کہیں لکھتے ہیں تری حمد کے لفظ

یوں تری ذات کی تفہیم ہوئی جاتی ہے
ایسے اسرار سکھاتے ہیں تری حمد کے لفظ

میں یہی سوچتا تھا، حمد لکھوں گا کیسے
پھر گھٹا وار جو برسے ہیں، تری حمد کے لفظ

بارہا اپنا قلم چوم لیا ہے میں نے
جب بھی قرطاس پہ لکھتے ہیں تری حمد کے لفظ

میں جہنم میں نہیں جاؤں گا اے ربِ انیس!
میں نے ان ہاتھوں سے لکھے ہیں تری حمد کے لفظ

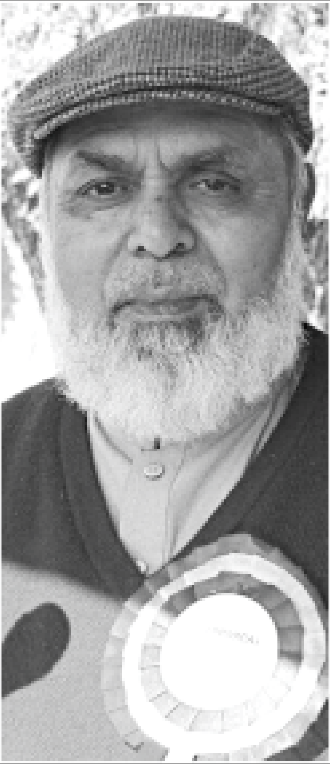

محمد انیس انصاری

حمد

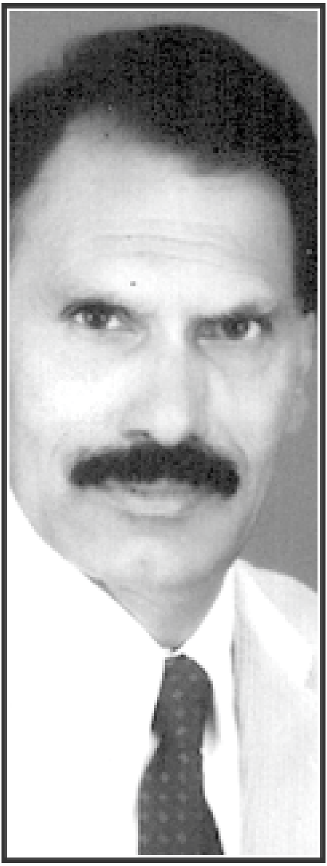

بخشی ہے مرے حرفوں کو توقیر اُسی نے
بھر دی ہے سخن میں مرے تاثیر اُسی نے

تقریر کی لذت سے کیا آشنا لب کو
بخشی ہے ، مرے خامے کو تحریر اُسی نے

ہر چیز اسی خالق و مختار کی تابع
لکھی ہے ہر اک چیز کی تقدیر اُسی نے

کرتا ہے وہی میری ہر اک سوچ مجسم
بخشی مرے ہر خواب کو تعبیر اُسی نے

احساس بھرا دل یہ جلیلؔ اُس کی عطا ہے
بخشی ہے مجھے درد کی جاگیر اُسی نے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرا رازق ہے ، رازق خلیوں کا
حمدیں کیا پہنچیں ، گجرا گیتوں کا

حمد

پیدا لحن میں تمکنت سوز و ساز ہو
مولا مرے سخن کی طبیعت گداز ہو

مجھ پر مرے وجود کی اپنی گرہ کھلے
آنکھوں کو دے نمی مرا دل بھی گداز ہو

تو کیا ہے یہ بھی پوچھنا مجھ کو روا نہیں
میں کیا ہوں مجھ پہ اتنا تو افشائے راز ہو

خوئے قبول میری طبیعت کو کر عطا
میری بھی طبع کاش کہ رشک ایاز ہو

(ق)

پھیلے کسی کے سامنے دست سوال کیوں
دست طلب اسی کے ہی آگے دراز ہو

واجب ہر ایک سانس پہ تسبیح شکر ہے
ہر ہر قدم اسی کی عنایت پہ ناز ہو

مسرور ہوں لوگ جس گھڑی غفلت کی نیند میں
خالق سے اٹھ کے اس گھڑی راز و نیاز ہو

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

جو بھی ہم تک خدا سے آیا ہے
اُن لبوں کی عطا سے آیا ہے

اُسؐ نے جو کچھ کہا جہاں اُس پر
لاکھ سہو و خطا سے آیا ہے

جتنا دنیا کا نقدِ حکمت ہے
اعتکافِ حرا سے آیا ہے

عصرِ حاضر تلک پیام اُسؐ کا
ہو کے صد کربلا سے آیا ہے

جتنی سمتوں میں جو اجالا ہے
اُسی نورِ ہدیٰ سے آیا ہے

آدمیت میں جوہرِ اخلاص
اُسؐ کے فقر و غنا سے آیا ہے

وہ سبق بھی بہت ضروری تھا
جو اُحد کی سزا سے آیا ہے

رحمِ رب کے کہاں تھے ہم لائق
اُسؐ کی مانگی دعا سے آیا ہے

دیکھ اُس کی امر کہانی میں
عدل تو ابتدا سے آیا ہے

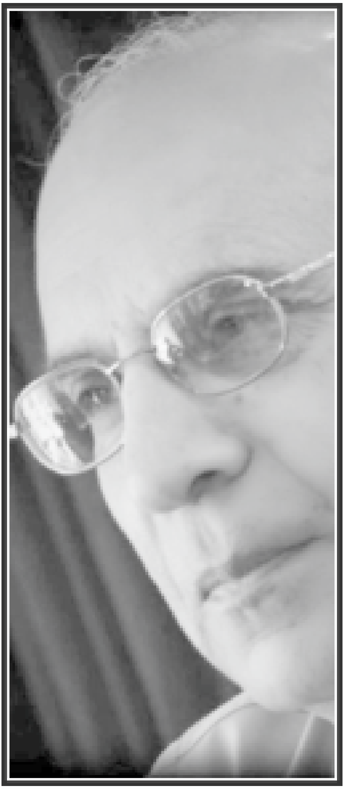

جلیل عالی

نعتؐ

خاور اعجاز

دہر میں روشنی آپؐ کے نام سے
زندگی ، زندگی آپؐ کے نام سے

عرصۂ حشر کے بعد بھی پائے گا
اعتبار ، آدمی آپؐ کے نام سے

آپؐ کے ذکر سے ہے ضیا بار شب
صبح کی تازگی آپؐ کے نام سے

اہلِ عالم میں بے چہرہ ، بے نام تھے
سرخروئی ملی آپؐ کے نام سے

اوج قلب و نظر پا گیا آدمی
معرفت مل گئی آپؐ کے نام سے

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نعتؐ

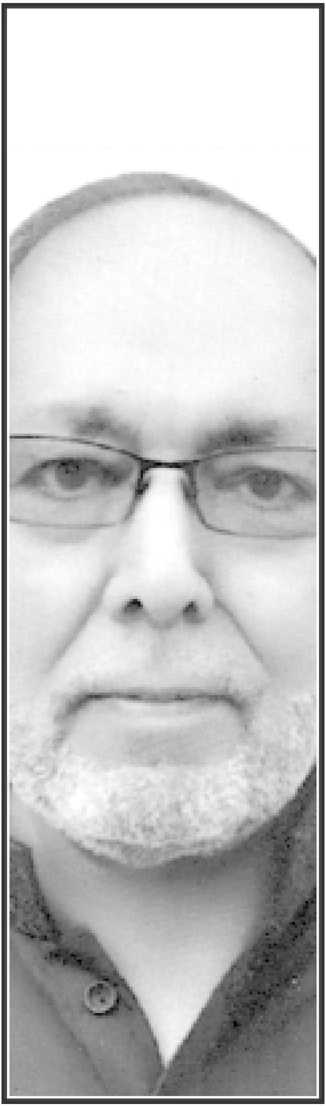

''درود پڑھتے رہو اور رابطے میں رہو''
کسی بہانے سدا اُنؐ کے تذکرے میں رہو

یہ خدشہ ہو گا نہ لاحق کہ راستے میں رہو
''درود پڑھتے رہو اور رابطے میں رہو''

نبیؐ کی شان میں نعتیں کہو ، درود پڑھو
جڑے ہوئے یوں مودّت کے سلسلے میں رہو

جو اُنؐ کی راہ پہ چلتا ہے احتیاط کے ساتھ
اُسی کے ساتھ چلو ، ایسے قافلے میں رہو

نبیؐ کریم کے ہر قول پر یقیں کر کے
ہر اک گماں سے بچو، یوں نہ مخمصے میں رہو

اسی میں خیر بھی ہے اور عافیت بھی ہے
نبی کریمؐ کے طے کردہ دائرے میں رہو

جو گامزن ہو مدینہ کی سمت ہی ہر دم
نسیمؔ تم اُنہی لوگوں کے قافلے میں رہو

نسیم سحر

نعتؐ

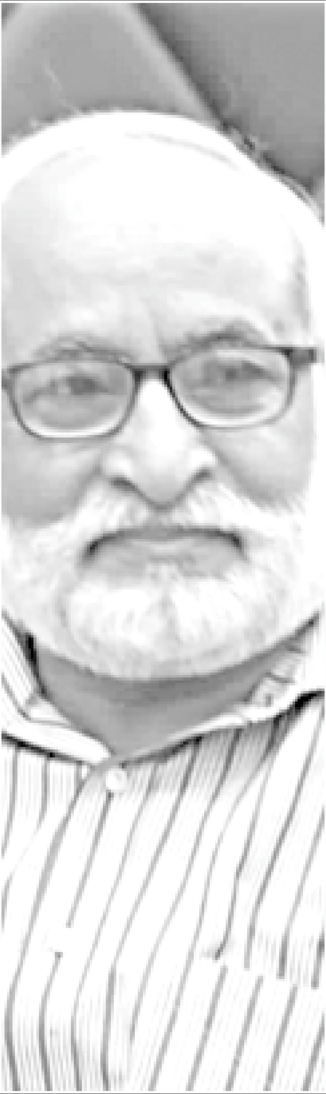

آپ کی نظرِ کرم سے کام سارے ہو گئے
''مشکلیں حل ہو گئیں وارے نیارے ہو گئے''

آپؐ کی آمد ہوئی یثرب مدینہ ہو گیا
پاؤں چُھو کر ریت کے ذرّے ستارے ہو گئے

مِل گیا اِذنِ حضوری بَن گئے بگڑے نصیب
رحمتُ اللعالمیں کے جب اِشارے ہو گئے

آپؐ لائے بحرِ ظلمت میں سفینہ نور کا
جو بھنور رستے میں تھے سمٹے کنارے ہو گئے

کوئلوں پر جل کے کُندن ہو گیا جسمِ بلال
پھر منافع بخش اُن کے سب خسارے ہو گئے

آپ نے چُھو کر عطا کی جن درختوں کو بہار
وہ نبیؐ کی نعت کے تازہ شمارے ہو گئے

ہو گئی کافور ظُلمت چھا گیا نورِ سحر
دیدنی عرب و عجم کے رنگ سارے ہو گئے

اکرم سحر فارانی

نعتؐ

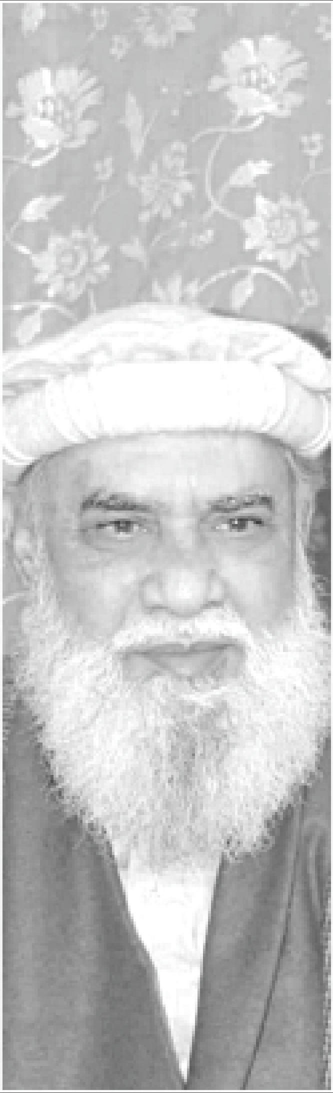

اے کاش کہ مل جاتا مجھے انؐ کا زمانہ
وہ سارے زمانوں سے جو اچھا تھا زمانہ

مولا مری خواہش کو پذیرائی عطا کر
"خواہش ہے مری نعت سنے سارا زمانہ"

ہر دور میں ہر قوم کا اک اپنا نبی تھا
اب آپؐ کی امت میں ہے یہ سارا زمانہ

مل سکتا نہیں آپ سا کھنگال کے دیکھو
آئندہ کا ہو یا کہ ہو وہ گزرا زمانہ

میرے لیے بس آپؐ کی چاہت ہی بہت ہے
اک سمت ہیں آپؐ ایک طرف سارا زمانہ

جس طرح ملی آپ کو امت ہے چنیدہ
ویسے ہی زمانوں میں چنیدہ تھا زمانہ

اکرم ناصر

نعتؐ

قلزم پہ بھی آنکھ نہ دریا نظر آیا
عشاق کو ہر سمت مدینہ نظر آیا

آدابِ حریمِ نبوی کیسے بیاں ہوں
ہر اہلِ نظر ، عجز سراپا نظر آیا

تقدیس میں، تبریک میں، الطاف وعطا میں
دربارِ نبی ، کعبے کا کعبہ نظر آیا

چُومے ہیں قدم ہم نے بصد شوق ومحبت
جس جا بھی کوئی زائرِ طیبہ نظر آیا

یوسفؑ سے بھی پوچھو تو گواہی یہی دیں گے
دو جگ میں نہیں ایک بھی اُن سا نظر آیا

جبریلؑ سے پوچھو مرے سرکار کے رُتبے
ابلیس پہ کھلتا ہی نہیں ، کیا نظر آیا

ہر وصف میں، ہر رنگ میں، ہر شان میں لاریب
چاند آمنہؓ کا خلق سے اونچا نظر آیا

اُس ذات کے سائے میں ہیں دراصل دوعالم
جس کا کہ کسی کو نہیں سایہ نظر آیا

کیا بات ہے مداحِؐ خورشیدِ حرا کی
کس اوج پہ قسمت کا ستارہ نظر آیا

ذکرِ شہِ کوثر سے سبھی ہوگئے سیراب
محفل میں نہیں ایک بھی پیاسا نظر آیا

دُکھ چھوڑ دیے، غم بھولیے، جھوم اُٹھیے سراسر
"وہ دیکھیے وہ گنبدِ خضریٰ نظر آیا"

جس کو بھی ملا، جو بھی ملا ذاتِ خدا سے
فیضاؔن کو محبوب کا صدقہ نظر آیا

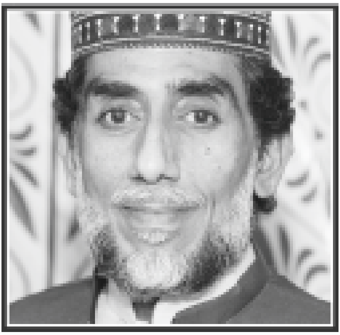

فیض رسول فیضان

نعتؐ

وہ ایک ہے پر سب کے مسائل کا وہ حل ہے
پیغام ہے، ترغیب و طریقہ ہے، عمل ہے

مکّے کا طواف اور ہے طیبہ کا طواف اور
اک فرض کی تکمیل ہے، اک عشق کا پھل ہے

ہم اسوۂ احمد سے سرِ مُو نہیں ہٹتے
سجدہ ہے تو سجدہ ہے، رمَل ہے تو رمَل ہے

کوثر کے طلب گاروں کا روزہ نہیں کُھلتا
زم زم بھی میسّر ہے انھیں، گنگا کا جل ہے

یہ بات کلیشے ہے مگر سچ تو یہی ہے
اُس جیسا زمانے میں کوئی آج نہ کل ہے

کچھ گھڑیاں رہا روضۂ جنت میں مَیں تنہا
کب اس کے برابر کا کوئی ایک بھی پل ہے

منظر اعجاز منظر

مدینہ یوں تو کسی دور کی زمیں پہ ہے
جو دل پہ ہاتھ رکھو تو یہیں کہیں پہ ہے

یہ ممکنات کی دنیا یہ وسعتِ افلاک
یہ وہ گمان جو قائم مرے یقیں پہ ہے

اور اس جہاں میں مدارِ صحیح و کُل اغلاط
مرے رسول فقط تیری ہاں نہیں پہ ہے

جو حاضری کو چلا جائے کب اُسے ہے یاد
وہ کتنا لوٹتا ہے کس قدر وہیں پہ ہے

غبارِ اشک میں کچھ ٹھیک سے نہیں دیکھا
کہیں پہ سبز، سنہرا کہیں کہیں پہ ہے

کُل اور رنگ تھا تو آج اور گنبد کا
ہمارا مسلک و تکیہ مگر مکیں پہ ہے

نعتؐ

یہ ہی نہیں زمین و زماں کی سنی گئی
وہ آ گئے تو ہفت مکاں کی سنی گئی

ان کے طفیل نکھرے خد و خال زندگی
وہ جلوہ گر ہوئے تو جہاں کی سنی گئی

اس نطق سے پتا چلا قند اور شہد کا
لب وا ہوئے تو حرف و بیاں کی سنی گئی

بینا ہوئی نگاہ تو سب بے کلی مٹی
طیبہ میں آ کے دیدہ و جاں کی سنی گئی

جو آ گیا اسی کا بھرا دامن مراد
کب یہ ہوا کہ صرف فلاں کی سنی گئی

مہر و مہ و نجوم کے چہرے بھی کھل اٹھے
رکھے قدم تو کاہکشاں کی سنی گئی

لکھتا ہوں اور پڑھتا ہوں اپنے نبیؐ کی نعت
میرے سخن کی میری زباں کی سنی گئی

آیا پیام لے کے مدینے کا نامہ بر
صد شکر میرے اشک رواں کی سنی گئی

سرور قرار پاتے ہیں سب پا شکستگاں
ان کے حضور خستہ دلاں کی سنی گئی

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

آسماں عرصۂ ناز کا سایہ ہے
یہ جہاں نکہتِ راز کا سایہ ہے

بے کراں موج زن نغمۂ کن فکاں
سایۂ نقشِ پرواز کا سایہ ہے

آئنہ خانۂ بزمِ بود و نبود
نزہتِ عکسِ انداز کا سایہ ہے

گلشنِ خلد میں چشمۂ سلسبیل
چشمِ رحمت کی آواز کا سایہ ہے

یہ عروسانِ گل پوش کی انجمن
خاکِ طیبہ کے اغماز کا سایہ ہے

یہ گل و لالہ و یاسمین و سمن
جسمِ اطہر کے اعجاز کا سایہ ہے

فرشِ پابوس ہے چادرِ کہکشاں
سورج آئینۂ ناز کا سایہ ہے

چشمکِ موجۂ برقِ طورِ کلیم
قاب قوسین کے راز کا سایہ ہے

محمد نصیر زندہ

نعتؐ

مانگو جو مانگنا ہے اِدھر سوچتے نہیں
جب شاہِؐ دو جہاں کا ہو در سوچتے نہیں

میرے نبیؐ کے ایک اشارے کے منتظر
جب حکم ہو تو شمس و قمر سوچتے نہیں

لا ترفعو اَصواتکم یہ دھیان میں رہے
لہجہ سنبھالو کس کا ہے گھر سوچتے نہیں؟

جب کہہ دیا ہے خود کو غلامِ درِ نبیؐ
جیسے بھی زندگی ہو بسر سوچتے نہیں

ان کے صغیرؔ ایک بلاوے کی دیر ہے
جتنا کٹھن ہو جیسا سفر سوچتے نہیں

صغیر احمد صغیر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اک سطر میں ہوئے ورقِ جان و تن تمام
لیکن ہوا نہ تذکرۂ پیرہن تمام

ایک نعتیہ نظم

ذکر ہے آپؐ کا
سو مکمل نہ ہو پائے گا
تا قیامت سخن ور ادھوری سی کوشش کو
تعریف و توصیف کا نام دیتے رہیں گے
مگر ذکر ہے آپؐ کا
سو مکمل نہ ہو پائے گا
سوچتا ہوں کہ میں
آسمانی صحیفے کی آیات کا ایک ہالہ بناؤں
موتی، پکھراج نیلم فیروزے کی روشنائی سے
اور زمرد و مرجان کی خوبصورت تراشید قلموں سے
زبرجد و یاقوت کی تختیوں پر لکھوں آپؐ کی زندگی
در گزر سادگی اور دل جوئی کرتی ہوئی
دو جہانوں کی رحمت لکھوں اور لکھتا رہوں
مگر__ ذکر ہے آپؐ کا
سو مکمل نہ ہو پائے گا
سوچتا ہوں کہ میں
نقرئی حرف چن کر مدینے کی گلیوں میں
اسم محمدؐ کے طغرے لگاؤں
دف بجاتی ہوئی بچیوں کا تبسم سمیٹوں
موج در موج بڑھتی سمٹتی ہوئی ریت کی
بیکرانی میں قصوئی کے پیچھے چلوں
جہاں دھول اڑتی ملے اس جگہ
آنسوؤں کا ترنکا لگاؤ
گیلی مٹی پہ نعلین کا نقش ہو
اور اس نقش کو میں ہتھیلی پہ رکھوں
فلک کو سجاؤں
جتنے اوصاف ہیں اُن کی چادر بناؤں
برہنہ زمیں کو اڑھاؤں
مگر کیا کروں بے بسی ہے بشر ہوں
خطا کار ہوں
ایک کچی قلم اور اشکوں سے بھیگا ہوا ملگجا
ایک کاغذ کا ٹکڑا مرے روبرو ہے
ذکر ہے آپؐ کا
سو مکمل نہ ہو پائے گا
تا قیامت سخن ور ادھوری سی کوشش کو
تعریف و توصیف کا نام دیتے رہیں گے
مگر ذکر ہے آپؐ کا
سو مکمل نہ ہو پائے گا

اعجاز رضوی

عقیدت

انعامِ کردگار ہے چاہت حضورؐ کی
سرمایۂ حیات ہے نسبت حضورؐ کی

عقل و دل و نگاہ مسلمان ہو گئے
انسانیت پہ خاص ہے رحمت حضورؐ کی

بے مثل قول و فعل بھی کردار ساز ہے
سو جان سے عزیز ہے سیرت حضورؐ کی

گرتے ہوؤں کو آپؐ نے تھاما ہے بے دریغ
لازم ہے بالضرور شفاعت حضورؐ کی

تخلیقِ کائنات کی غایت حضورؐ ہیں
ہے رحمتِ مدام نبوت حضورؐ کی

ہے اقتدا پہ آپؐ کی سب انبیا کو ناز
فخرِ رسل ہے کیسی امامت حضورؐ کی

مدحت سرائی آپؐ کی کسبِ ہنر مرا
ہر گل شگفتگی ہے عنایت حضورؐ کی

منشورِ کائنات ہے اسوہ حضورؐ کا
بے مثل ہے ریاضؔ عدالت حضورؐ کی

سید ریاض حسین زیدی

عقیدت

دنیا میں دائیں بائیں نہ بیکار دیکھیے
ہے دیکھنا تو طیبہ کا گلزار دیکھیے

یک جان ہو کے بیٹھے ہیں تیار، دیکھیے
اسلام کو مٹانے کو اغیار دیکھیے

پھرتے ہیں انتشار میں اب خانماں خراب
حالت ہماری سیدِ ابرار دیکھیے

آئے فقیر جھولیاں بھر بھر کے لے گئے
ان کے کرم بھی تازہ ہیں ہر بار دیکھیے

اب بھی نزول کرتے ہیں لاکھوں ملائکہ
اس جا قدم قدم پہ ہیں انوار دیکھیے

کعبے کی چھت پہ گونج بلالی اذاں کی تھی
اسلام کے غلاموں کا معیار دیکھیے

اذنِ خدا سے کیجیے اب تو شفاعتیں
سب امتیں پریشاں ہیں سرکار دیکھیے

سب امتی، حضور کے قدموں میں ہیں رضاؔ
محشر میں بھی حبیب ہیں سالار دیکھیے

رضا اللہ حیدر

عقیدت

محمد افضال انجم

درکار مجھے تو بھی ہے اور تیری نظر بھی
ہو مجھ کو خداوندا عطا بزمِ سحر بھی

جز تیرے نہ ہو کچھ بھی مرے قلب و نظر میں
خم آگے رہے تیرے مرا دل بھی یہ سر بھی

اُلفت کا تمھاری وہ شجر دل میں اُگا ہے
للہ لگے اس پہ کوئی اب تو ثمر بھی

کعبہ کو ترے دیکھا حضوری کی نظر سے
پھر دیکھے ان آنکھوں سے اُسے مجھ سا بشر بھی

تجھ بن نہ کسی اور کو چاہوں سرِ دنیا
بن جائے تری راہ مری راہگزر بھی

چمکیں تری یکتائی سے گھر کے درودیوار
مہکے تری خوشبوئے احد سے مرا گھر بھی

اس دل میں فقط خوف اُجاگر رہے تیرا
پھٹکے نہ قریں اپنے کسی اور کا ڈر بھی

عقیدت

ہے لب پہ اس لیے ہر دم دعائے صلِ علیٰ
کہ ربِ رحم و کرم ہے خدائے صلی علیٰ

درودِ آلِ محمد میں ہر دعا ہے نہاں
کچھ اور مانگیے کیا؟ ماورائے صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمد پڑھو کہ دنیا بھی
اگر کسی کی ہے بگڑی بنائے صلِ علیٰ

یہ میں یہ صلِ وسلم پڑھوں ہوں، کن کن کے
کہاں ہے ورنہ؟ کوئی انتہائے صلِ علیٰ

ہیں سب کے حق میں مدثر مزمل اس لیے وہ
کہ اوڑھے عصمت و عفّت ردائے صلِ علیٰ

بجھا سکے گی نہ باطل کی کوئی پھونک اسے
چراغِ حق ہے ابد تک ضیائے صلی علیٰ

ہے آج بھی کہیں گر فی قلوبھم مرض
ہے سب کے درد کا درماں دوائے صلِ علیٰ

درود ہے مئے عرفاں اور اسے بھی بڑھ کے
ہے وہ جو ساقیٔ کوثر پلائے صلِ علیٰ

نمازِ فرض کا کوئی امام ہو کہ نہ ہو
صلوٰۃِ عشقِ محمد پڑھائے صلِ علیٰ

رہِ مسافرِ حق کی ہے اور کیا منزل؟
درِ نبی پہ اسے لے کے جائے صلِ علیٰ

حروفِ شمعِ معانی پہ ناز کرتے ہیں
کہ جب بھی بزمِ تخیل میں آئے صلِ علیٰ

یہ گھر اُجاڑ نہیں سکتا پھر کوئی کہ اگر
دلوں میں حُبِّ مدینہ بسائے صلِ علیٰ

سخن ہے کیا؟ نہ اگر ہو ہمارا سارا وجود
نبی سے عہد میں وقفِ وفائے صلِ علیٰ

ہیں نورِ صبحِ ازل وہ، ہے روشن اُن سے ابد
ہمیں ہے جو بھی ملا، ہے عطائے صلِ علیٰ

ملے جو حق سے تجھے چشمِ حق نگر اے دل
تو دیکھے ہر جگہ نورِ فضائے صلِ علیٰ

بشر کے شر سے زحمت جہان میں ورنہ
فروغِ خیر سے رحمت نمائے صلِ علیٰ

کسی گھٹن کا نہیں ڈر کہ راحتِ جاں ہے
نسیمِ نعتِ محمد صبائے صلِ علیٰ

ہوا نہ آپ سے آصف! کہ جنگ غیروں سے
ہے سب پہ فتح کی ضامن ولائے صلِ علیٰ

مرزا آصف رسول

رباعیات

پاکیزہ گُلِ صاحبِ لولاک رکھے
دوران سے ہوس کے خس و خاشاک رکھے
تطہیر کی حقدار ہوئی آلِ نبی
اللہ نے چاہا کہ اسے پاک رکھے

....

عاجز ہے زباں ہمسرا کیسے ہو
مجبور ہیں لب ان پہ ثنا کیسے ہو
ہم وصف محمد کے نہیں گن سکتے
محمود کی توصیف ادا کیسے ہو

....

کرتے ہیں ثنا ان کی نوشتے سارے
پاکیزہ ہیں جس ذات سے رشتے سارے
سب بھیجتے رہتے ہیں پیمبرؐ پہ درود
اللہ اور اسکے فرشتے سارے

....

کیا میم محبت کی رسد میں آئی
قادر کی بھی تائید سند میں آئی
وہ حمد سے پہلے تو محمدؐ ٹھہرے
احمد ہوئی جس وقت احد میں آئی

....

اسلام ہوا دینِ خدا دینِ نبیؐ
قرآن ہے اخلاقِ رسولِ عربی
ان تک بھی رسائی ہے ضروری ورنہ
رہ جائے گی بندوں کے لئے بولہبی

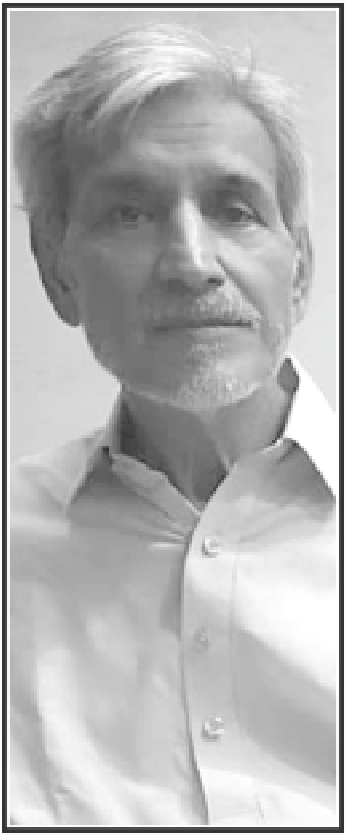

گلزار بخاری

رباعیات

سمجھا ہوں یہ دربار میں آتے جاتے
بہتر تھا کہ بازار میں آتے جاتے
اُس دور میں ہم لوگ ہیں سیدھے سادے
ضائع ہوئے بیکار میں آتے جاتے

....

رستے میں پڑا پھول اٹھایا میں نے
ہر ایک سے خوشبو کو چھپایا میں نے
خاموش محبت کو رکھا سینے میں
کاغذ پہ کوئی دل نہ بنایا میں نے

....

کچھ نیند کے ماروں کی تھی تیاری کم
اوپر سے سفر زادوں کی بیداری کم
آغازِ سفر تھا بوجھل قدموں سے
ہوتی نہیں اشجار کی بیزاری کم

....

نیلے یہ مرے ہاتھ ہوئے، سردی سے
منظر ہوا پیلا کس کی زردی سے
صحرا جو مکاں میرا کبھی ہوتا تھا
ناراض ہوا آوارہ گردی سے

....

خوشبو کا طلبگار بھی بیکار گیا
سپنوں کا خریدار بھی بیکار گیا
الفت کے معاملے میں سب نے دیکھا
مجھ جیسا سمجھدار بھی بیکار گیا

....

اک بار نہ پوچھی گئی مرضی میری
اوراق میں سڑتی رہی عرضی میری
جس جا بھی ضرورت پڑی میری اس کو
تصویر لگا دی کوئی فرضی میری

....

اب کھل کے بتا یار تو اپنی مرضی
مجھ سے نہ چھپا یار تو اپنی مرضی
زندہ تجھے چھوڑے گی نہ اب خاموشی
پتھر کو سنا یار تو اپنی مرضی

....

جلتے ہوئے اشجار کو کل دیکھیں گے
گرتی ہوئی دیوار کو کل دیکھیں گے
یہ وقت ہے دشمن کی صفیں چیرنے کا
اجڑے ہوئے دربار کو کل دیکھیں گے

سعید اشعر

ہائیکو

باہر دھول ہی دھول
آنگن میں لیکن مہکیں
چنبیلی کے پھول

دل موسم بدلے
وہ بھی اگر میری ہی طرح
فون کی سم بدلے

آتے ہیں دمساز
قبر میں جب بھی گونجی ہے
قدموں کی آواز

انساں کی ہستی
فوارے کے دامن میں
کاغذ کی کشتی

ایماں نا مربوط
چھت کے چوبی تختوں سے
جھانکتے ہیں جن بھوت

خاور اعجاز

اُردو ماہیے

کھو جائیں تو روتے ہیں
قدر نہیں کرتے
جب پاس وہ ہوتے ہیں

پیپل کی گھنی چھایا
کون؟ بشیر احمد!
چپ چاپ چلا آیا

کب گھاس ہری ہو گی
قیدِ شبِ غم سے
کب جان بری ہو گی

اب دودھ ملائی میں
کون تمہیں پوچھے
سجنی کی سگائی میں

جب لوٹ کے آئے گا
دل دار سجن میرا
ہر پھر کے ستائے گا

کیا شکوہ زمانے سے
وہ ناز اٹھاتا تھا
چائے کے بہانے سے

سجنی سے سہیلی تک
جا پہنچی آخر
وہ بات حویلی تک

کچھ رسمیں نبھا کے تم
خود پچھتاؤ گے
ڈولی میں بٹھا کے تم

خاموش بشیر احمد!
غالب ہے غالب
ہم سمجھے نہیں خد، مد

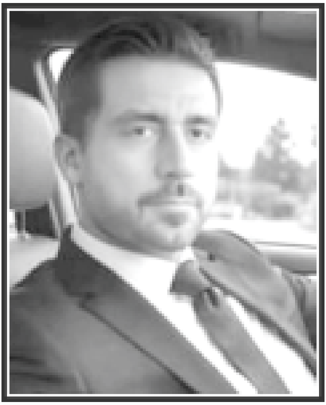

بشیر احمد حبیب

دوہے

کیکر کانٹے رات دن، گٹھڑی میرے عیب
میرے سر پہ ہاتھ رکھ، تو مالک لاریب

ندیا دریا خوب ہیں، جھیل سمندر خوب
تجھ کو گر ہے ڈوبنا، اپنے اندر ڈوب

میں نے دیکھا خواب میں، سورج بنتا قاب
کون بتائے گا یہاں، اس پوتھی کا باب

تخت بچھے دالان میں، تمباکو میں راب
محفلِ یاراں ہوگئی، اک دوجے کا خواب

قطرہ قطرہ تھی جھڑی، ہلکی ہلکی چاپ
باہر کے جاکے دیکھتی، کس میں اتنی تاب

چاروں جانب تیرگی، سورج ہوا غروب
میں جنگل کے بیچ ہوں، مشرق بنا جنوب

اب بھی تیرے نام کا، کھاؤں گا میں فریب
اونچائی کو دیکھتے، دیکھوں نہ میں نشیب

وصل جدائی ثانوی، روشن رہیں قلوب
جینا مرنا روز کا، الفت کے یہ وجوب

مجھ پر حق سے آج کچھ، واضح ہوئے غیوب
مجھ میں میرے دوستوں، ڈھونڈو نئے عیوب

پہن کے اپنے پاؤں میں، سونے کی پازیب
ناچ رہا ہے آنکھ میں، میرا ہی آسیب

سعید اشعر

آئینے میں مرتا ہوا عکس

وسیم جبران

شہر کی گلیاں اس رات کچھ زیادہ ہی خاموش تھیں۔ جیسے سب اپنی سانس روک کر کسی ان دیکھے خوف کو سن رہی ہوں۔ بارش کے بعد کی نمی دیواروں اور پتھریلی سڑکوں سے بخارات کی طرح اٹھ رہی تھی۔ اسی ادھورے سکوت میں، ریلوے سٹیشن کے قریب ایک پرانے چائے خانے کی بتی ٹمٹما رہی تھی۔ اس نیم تاریک چائے خانے میں، جہاں سگریٹ کے دھوئیں اور پرانی موسیقی کی سرگوشیاں گڈمڈ تھیں، زیادہ تر میزیں خالی تھیں۔ ایک میز پر چند گاہک خاموش بیٹھے تھے۔ دوسری طرف دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک کونہ پسند کیا اور وہاں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا سکون تھا، لیکن آنکھوں میں گہری تھکن اور چھپا ہوا کرب تھا۔ ویٹر نے اس کے سامنے چائے کا کپ لا کر رکھا۔ وہ دیوار کو ایسے گھور رہا تھا جیسے کسی نادیدہ تحریر کو پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

چائے خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس شخص کے بدن پر سیاہ

رنگ کا اوورکوٹ تھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں، جیسے پتھر پر پانی بہتا ہے مگر کوئی نقش نہیں چھوڑتا۔ اس نے ایک لمحہ رک کر چاروں طرف دیکھا پھر ایک کونے میں بیٹھے ہوئے اجنبی پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔

وہ اجنبی ایک کونے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آدھا بھرا ہوا کپ رکھا تھا، جس کی بھاپ دھیرے دھیرے سرد ہو رہی تھی۔

وہ اپنی انگلیوں میں سگریٹ دبائے کسی ان دیکھے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے، چہرے پر ہلکی سی زردی اور ہونٹوں پر ایک عجیب تلخ مسکراہٹ۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی کے سفر نے اسے ہڈیوں تک تھکا دیا ہو۔

وہ سمجھ گیا کہ یہی اس کا مطلوبہ شخص ہے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اجنبی نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ اوورکوٹ والا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اجنبی کی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اوورکوٹ والا چند لمحے خاموش رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔

”شاید وہ تم ہی ہو جس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔“ اجنبی نے ایک گہری سانس لی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔

”ہاں، وہ میں ہی ہوں۔“ اوورکوٹ والے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کش لیا۔ جیسے وہ چاہتا تھا کہ اجنبی گفتگو کا آغاز کرے۔

”تم جانتے ہو تمھیں کس لیے بلایا ہے؟“ اجنبی نے مدھم آواز میں کہا۔

اوورکوٹ والے نے دھواں منہ سے خارج کیا، ”کام کی نوعیت ہی میرا تعارف ہے۔ نشانہ بتاؤ، باقی سب میرا معاملہ ہے۔“

اچانک شیشے کی کھڑکیوں سے بجلی کی چمک دکھائی دی اس کے ساتھ ہی بادل گرجا۔

”شاید بارش پھر سے شروع ہو گئی ہے۔“ اجنبی نے خود کلامی کی پھر اوورکوٹ والے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمھیں میری تلاش میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔“ اوورکوٹ والا اس کی طرف جھکا۔ ”مجھے کبھی کسی کو تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔“ اس کے چہرے پر جذبات کی کوئی لکیر نہ تھی، صرف ہونٹوں پر ایک خفیف طنزیہ خم نمایاں تھا۔ اجنبی نے سر ہلایا پھر جیب سے ایک لفافہ نکالا، اسے کھول کر اس نے ایک پرانی تصویر نکالی۔ روشنی میں اس کے کنارے بوسیدہ لگ رہے تھے۔ تصویر کا رخ اجنبی کی طرف تھا اوورکوٹ والا اس کی بیک سائیڈ دیکھ رہا تھا۔ اجنبی نے تصویر کو واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے سرگوشی کی:

”اسے ختم کرنا ہے۔ اس تصویر کے پیچھے

اُس کا پتا لکھا ہے۔ مگر تصویر ابھی مت دیکھو۔ اپنے ٹھکانے پر جا کے دیکھنا۔ وقت آنے پر پہچان جاؤ گے۔ بس ایک ہی بات یاد رکھو، یہ شخص اس دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔''

اوور کوٹ والے نے تصویر جیب میں ڈال لی۔ کوئی سوال نہ کیا، کوئی تجسس نہ دکھایا۔ جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ اس کھیل میں جتنی کم بات ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ پیشہ اعتماد اور شک کے درمیان تنے ہوئے رستے پر چلنے جیسا ہے۔ زیادہ جاننے کی قیمت اکثر زندگی ہوتی ہے۔

''پوچھو گے نہیں کہ میں یہ کام کیوں کرنا چاہتا ہوں۔'' اجنبی نے آہستہ اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کام سے اور اپنے معاوضے سے غرض ہے، کیا اور کیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اوور کوٹ والے کی آواز سپاٹ تھی۔

''ہوں، اچھا یاد دلایا، فکر مت کرو، میں تمھاری رقم ساتھ لایا ہوں لیکن اس سے پہلے میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

اوور کوٹ والے نے لمحہ بھر اجنبی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا: ''حکم کریں۔''

اجنبی نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اُسے کس طرح ختم کرو گے؟''

''کیا یہ جاننا ضروری ہے، میں اپنا کام خوب جانتا ہوں۔''

''مجھے تمھارے کام پر شک نہیں، دراصل میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا وار کرو کہ وہ ایک لمحے میں ختم ہو جائے۔''

''فکر نہ کرو، ایسا ہی ہوگا۔''

''تم کوئی چاقو یا خنجر استعمال کرو گے یا گولی؟''

''یہ پیشہ ورانہ راز ہے، بہر حال تم شاید پہلی بار ایسا کام کرنا چاہتے ہو، اس لیے بتا دیتا ہوں کہ چاقو اور خنجر بہت پرانے دور کی باتیں ہیں۔''

''گویا پستول یا ریوالور ہوگا، میری گزارش یہ ہے کہ گولی سیدھی دل پر لگنی چاہیے، نشانہ چُوک گیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا، سر میں بھی گولی ماری جا سکتی ہے۔''

''یا کوئی ایسا طریقہ جس میں اسے تکلیف کا احساس بھی نہ ہو اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔''

''لگتا ہے تمھیں مقتول سے بہت ہمدردی ہے، ایسا ہے تو تم خود کیوں نہیں یہ کام کر لیتے۔''

اوور کوٹ والے نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے گردن ہلائی۔ اجنبی نے

ایک بار دائیں بائیں کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ’’ٹھیک ہے تم اپنے طریقے سے کام کرو، شاید میں غیر ضروری باتیں کر رہا ہوں۔‘‘ پھر اُس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اوورکوٹ والے کے سامنے رکھ دیا۔

’’اس میں پوری رقم موجود ہے، چاہو تو گن لو۔‘‘ اوورکوٹ والے نے لفافہ اٹھایا اور خاموشی سے جیب میں ڈال لیا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ بارش کی بوندیں کھڑکی پر بجتی رہیں جیسے کسی پرانی گھڑی کی ٹک ٹک ہو۔ اجنبی نے گہری سانس لی اور کہا:

’’یہ آخری سودا ہے۔ اس کے بعد نہ تمھیں میری تلاش رہے گی نہ مجھے تمہاری۔‘‘

اوورکوٹ والے نے سر ہلایا۔ ’’کام ہو جائے گا۔‘‘ اس نے یہ کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکلتا چلا گیا۔

رات گئے وہ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے کی بوسیدہ دیواروں پر نمی کے دھبے تھے اور ایک کونے میں ٹوٹا ہوا آئینہ رکھا تھا۔ اس نے لفافہ کھولا۔ تصویر سامنے آئی۔ چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا، مگر کمرے کی دھندلی روشنی میں اس کے خدوخال مبہم سے لگے۔ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تصویر اور اپنا چہرہ باری باری دیکھتا رہا۔ روشنی کی دھند میں دونوں ملنے لگے۔ آئینے کے کونے سے جھانکتی اپنی ہی پرچھائیں کو دیکھ کر اسے لگا کہ عکس اور تصویر ایک دوسرے میں گھلنے لگے ہیں۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا، لیکن پھر اس خیال کو جھٹک دیا۔

’’کیا ہر قتل دراصل خود کا قتل نہیں ہوتا؟ کیا ہم دوسروں کے جسم میں اپنے عکس کو ہی مارتے ہیں؟‘‘

اس نے سر جھٹکا۔ ’’نہیں — یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ کام تو کام ہوتا ہے۔‘‘ اُس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’سب چہرے ایک جیسے لگتے ہیں — آخر مرنے کے بعد سب کی پہچان مٹ ہی جاتی ہے۔‘‘ وہ دیر تک تصویر کو گھورتا رہا۔ سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں گرتی رہی۔ کمرے میں ہلکی زرد بتی جل رہی تھی۔ دیواروں پر پرانے کیل پر ایک بوسیدہ کیلنڈر تھا، بند کھڑکیوں سے آتی ہوا میں پرانی لکڑی کی سڑاند تھی۔ اُس نے لفافہ میز پر رکھ دیا۔

اگلی رات، اُس نے اپنے ہدف کا پیچھا شروع کیا۔ شہر کی تنگ گلیوں، نیم روشن چوراہوں، اور بارش سے بھیگتی سڑکوں پر وہ اس آدمی کے تعاقب میں رہا۔ کبھی اسے لگتا جیسے ہدف خود چلتے چلتے رُک جاتا اور پلٹ کر دیکھتا، جیسے جانتا ہو کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ مگر ہر بار وہ دھند کے پردے میں گم ہو جاتا۔

پھر ایک رات کے کسی سنسان پہر میں، دھند سے لپٹا ہوا شہر خاموشی کی بانہوں میں سو رہا تھا۔ نیم روشن گلیوں میں ٹمٹماتے ہوئے بلب ایسے لگتے جیسے مرنے سے پہلے آخری سانسیں بھر رہے ہوں۔ رات کے سناٹے میں شہر کے بوسیدہ حصے کی گلیاں کسی پراسرار لوری کی طرح مدھم سرگوشیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہوا میں نمی تھی، جیسے پرانی دیواروں نے برسوں کی نمی کو اپنے اندر قید کر رکھا ہو۔ وہ سیاہ اوورکوٹ میں لپٹا، ایک خالی چوک پر رکا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی، جیسے کوئی فیصلہ اندر ہی اندر اسے کاٹ رہا ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جس میں ہدف کی تصویر رکھی تھی۔

شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں، چاند کی زرد روشنی کے بیچ، وہ اجنبی تنہا چل رہا تھا۔ اسے شاید اندازہ بھی نہ تھا کہ اس کے پیچھے کوئی سایہ مسلسل قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں سرد فولاد کا وزن تھا، دل میں نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب۔ بس ایک کام۔

بارش کے بعد شہر کی گلیوں پر ایک عجب سا جمود طاری تھا۔ سڑکوں پر بجھی بجھی روشنیاں، دکانوں کے بند شٹر، کہیں کہیں کوئی آوارہ کتا یا بلی، اور ان کے بیچ ایک خاموش تنہائی جو دیواروں تک میں سرایت کر گئی تھی۔

''کبھی کبھی جینا بھی بوجھ بن جاتا ہے۔''

اجنبی نے اچانک رکے بغیر کہا۔ جیسے وہ جانتا ہو کوئی پیچھے ہے۔

اوورکوٹ والا خاموش رہا۔ صرف قدم تیز کیے۔

ایک لمحے میں فولاد کی چمک اور پھر ایک وار۔ اس کا نشانہ نہیں چوکا تھا۔ تیز دھار خنجر اجنبی کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ وہ آخری سانسیں لیتے ہوئے زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ قاتل نے اسے گھسیٹ کر گلی کے ایک کونے میں ڈالا اور جیب سے ٹارچ نکال کر اس کے بے جان چہرے پر روشنی ڈالی۔ یہ وہی چہرہ تھا جو چائے خانے میں اس کے سامنے تھا۔ لیکن قاتل کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی کبھی لوگ اپنی موت کو خود ہی خریدتے ہیں۔ اور وہ، قاتل، صرف ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

قاتل نے کچھ لمحے گہری خاموشی میں اس چہرے کو دیکھا، پھر آہستہ سے اُس عکس کی طرف متوجہ ہوا جو سامنے دکان کے شیشے میں جھلک رہا تھا۔ اس میں اس کا اپنا عکس لرز رہا تھا۔

اسے لگا جیسے آئینے میں وہ خود مر رہا ہے۔ پھر وہ پلٹا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

”سائیاں“

اطلاعی گھنٹی زور سے بجی تو گھر کے اندر کی طرف جاتے ہوئے میرے قدم باہر کی طرف مڑ گئے---

گیٹ کھولا تو سامنے بارہ تیرہ سال کا کوئی لڑکا کھڑا تھا۔

”آپ کو کوئی مسجد میں بلا رہا ہے۔“

”کون بلا رہا ہے؟؟ نام کیا ہے؟؟“

”جی بس انھوں نے آپ کے گھر کا پتا بتا کر کہا ہے کہ سائیاں سے کہو اب جلدی آ جائے۔“

”سائیاں“----

سائیاں-- ”سماعتوں میں جیسے شرنق رنگ کا کوئی رس گھلا گیا ہو--- دل کے تار ملے اور روح کے گھنگھرو چھن چھن بجنے لگے۔ روم روم رقص میں دیوانہ ہوا۔ یوں لگا جیسے ہر شے مجھے پکارنے لگی ہو--

تو کیا اُس خیال کے چمن میں میری یاد کا گلاب ابھی تک تازہ ہے--- ایک خوشگوار سی لہر دل میں اٹھی--- جس کی پھوار میں بھیگ کر من کی سرشاری روح تک اتر گئی--

سائیاں---- میں نے زیرِ لب دہرایا-- یہ نام تو فقط اُس کا دیا ہوا تھا باقی ساری دنیا کے لیے تو میں ”خاور شاہ“ تھا-- اِس سے پہلے کہ میرے قدم آگے کی طرف اٹھتے اُس لفظ کی مٹھاس نے میرے حال کو ماضی سے جا ملایا----

وہ کون تھا؟؟

بھری بستی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ذرہ مراد میرے دامن میں ڈال دیتا--- میرے لیے وہ اجنبی تھا-- -ایسا اجنبی جس پر میرا دل ہزار بار رفاقتیں نثار کرنے کو ہمکتا رہتا تھا--ماں، بابا، دادا کوئی نہیں جانتا تھا- وہ کون تھا؟؟؟ بس وہ تھا اور وہ ہے--وہ ہر گھر میں رہتا تھا اور ہر ٹبر کا فرد تھا۔ کسی کو میرے سوال سے غرض نہ تھی جیسے سب کے اطمینان کے لیے اُس کا ہونا ہی کافی تھا-- شاید پوری بستی میں ایک میں ہی تھا جو اُسے سوچتا تھا۔

وہ ملنگ ہے، جوگی، دیوانہ یا پروانہ--- مجھے اُس کے بارے میں کچھ بھی تو خبر نہ تھی یہاں تک کہ نام تک معلوم نہ تھا---- اُس کے چہرے اور حلیے سے بھی اُس کے متعلق اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ مست الست تھا یا زبردست-- نہ وہ کھویا کھویا تھا نہ کھلنڈرا، نہ گلے میں موتی منکے نہ ہاتھ میں کنگن کڑے، نہ سوٹا نہ سوتا---- نہ لباس کے چیتھڑے نہ لٹوں کا تجل--- درمیانہ قد، گول چہرہ،

سیدہ آیت گیلانی

جڑے ہوئے گھنے ابرو اور ہلکی ڈاڑھی --- نہ محراب نہ مندرہ مگر کچھ ایسا تھا کہ پہلی نظر میں دیکھنے والے کی آنکھ زیادہ دیر اُس کے چہرے پہ ٹک نہ سکتی تھی --- وہ سراپا سکوت تھا یا سکوت کا افسانہ یہ کون جانے؟؟ ---- چپ کے منتر پڑھنے والے کے سراپے میں کوئی چیز بولتی تھی تو وہ اس کی آنکھیں تھیں -- گھنی پلکوں کی اوٹ تلے گلابی ڈوروں کی ندی میں ہلکورے لیتی کشتی جیسی بے تحاشا بولتی آنکھیں -- جو پلکوں کے سائے میں چھپی ہر وقت نجانے کس خیال کے مصلے پر سجدہ ریز بے آواز بولتی رہتی تھیں۔

فکر کے مصلے پہ ہر دم کسی یاد کے اسم کی تلاوت کرتی عابد آنکھیں، جنھیں کبھی کبھی قسمت سے قیام کا اذن نصیب ہوتا تھا ورنہ تو اکثر عالمِ رکوع میں ہی جھکی رہتی تھیں۔ قیام کے اس دورانیے میں شاید اس کے قدم بستی میں پڑے تھے کہ بستی والوں کے سب سوال جواب صدیوں کی نیند اوڑھ کر سو گئے تھے --- ایک میں ہی تھا جو اس کی شناسائی کی گھاٹیوں میں کوئی تختی کوئی نشانی ڈھونڈتا پھرتا تھا شاید اس لئے کہ اُس کے قدموں کی دھمک کی پہلی ساعت میں میری پہلی دھڑکن کو اذنِ روانی ملا تھا۔

کیا وہ میرے لیے آیا تھا؟

اللہ بخشے بے بے کہا کرتی تھیں کہ کرمانوالے کے قدم بخت والے تھے۔ جس دن وہ آیا تھا اسی دن تین بہنوں کے بعد ماں کی جھولی کو میں نے آباد کیا تھا۔ میں اُس کے سامنے پلا بڑھا تھا مگر اس سے ایسے ہی ناواقف تھا جیسے بندہ آنے والے وقت سے۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پورا چاند ''پنڈ'' (گاؤں) کے ہر گھر کا مہمان بنا بیٹھک سجاتا تو میں چپکے چپکے چاند سے ساری باتیں کیا کرتا تھا۔ اُس کا بھی پتا پوچھتا پر چاند میری کہی ساری باتیں سنتا مگر خود کچھ نہ کہتا --- ایسے میں اُس کی خاموشی سیا کتا کر میں خود سے ہی الجھ کر رہ جاتا تھا۔

کیا میں یہاں نو وارد تھا؟؟؟

نہیں، یہ سوال تو میرے ساتھ ہی پلا بڑھا تھا چاچا دینو کے کنویں کا رہٹ، ڈھلوان میں بڑا میدان جہاں گڑ بنانے والوں کا بسیرا ہوتے ہی ہوا میٹھی ہو جاتی تھی بڑی مقدس ٹالی جس کے ٹُنّے کاٹنے کی جرات کسی میں نہ تھی کیونکہ مشہور تھا کہ وہ مزار والے بابا کی ملکیت ہے اس لئے ہر جمعرات اُس کے نیچے گاؤں کی عورتیں چراغ جلا کر ''ٹانگر'' اور ''ریوڑیاں'' بانٹا کرتی تھیں۔ اور سارے دنوں میں ایک یہی خوش نصیب دن تو تھا جب ماسی تاجاں کے کوسنوں سے دیدہ نادیدہ بچ جاتے تھے اور اُس کے چہرے کے سلوٹ زدہ نقش کچھ معمول پر آ جاتے تھے، اِس انقلاب کی واحد وجہ وہ میٹھی خریداری تھی جو جمعرات کے آتے ہی

پورے "پنڈ" کی عورتیں اُس دکان سے کرتیں جسے ماسی تاجاں نے گھر کے ایک کونے میں چار ڈبے رکھ کر "ہٹی" کا نام دے رکھا تھا- یہ اور بات کہ آج تک ماسی تاجاں کے گھر اور ہٹی کے درمیان حدِ فاصل کو میری آنکھیں ہر بار ڈھونڈنے کے باوجود ناکام رہی تھیں- مجھے سب کا کا کہہ کر بلاتے تھے اور مجھے اپنے گھر سے مسجد کا راستہ بھی معلوم تھا--- جہاں یہ سارے شواہد میرے وسوسے کو رد کر کے مجھے مطمئن کرنے کو کافی تھے کہ میں اسی دھرتی کی کوکھ کا جنما اور اسی گاؤں کی گود کا پالک ہوں- وہیں یہ سارے اشارے دلائل بن کر میرے شوق کو مزید ہوا دیتے ہوئے اُس کی کھوج کے بارے میں میری بے چینی اور بڑھا دیتے تھے- میں پہروں سوچا کرتا تھا کہ اتنی خبروں میں اس کی خبر کیوں نہیں-

اللہ جانے وہ مسجد کے اندر جاتا تھا یا نہیں لیکن صبح مسجد کے راستے میں اس سے سامنا برسوں کا معمول تھا- کئی بار کینوؤں کے باغ کی طرف جاتے اور گنے کے کھیتوں سے گنے توڑ کر لاتے ہوئے آتے جاتے بھی اس سے میرا ٹاکرا ہو جاتا تھا مگر اسے دیکھتے ہی اک عجیب کیفیت مجھے گھیر لیتی تھی- سنگی ساتھیوں سے کھیل کود ہنسی مذاق تو ایک طرف میں اور میرا وجود بھی ایک دوسرے سے ناآشنا ہو جاتے تھے- نہ سوال کی ہمت رہتی نہ جواب کا حوصلہ، قدم زمین کو جکڑ لیتے یا زمین قدموں کی زنجیر ہو جاتی تھی یہ تو نہیں معلوم بس کچھ ایسا ہوتا کہ آنکھ جھک جاتی اور دل سینے کے پنجرے میں کسی تازہ قید پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا- حیرت کی بات ہے کہ یہ لمحاتی کیفیت اس کے سامنے رہنے تک ہی میرے تن من میں ہیجان برپا کرتی--- کئی بار مجھے محسوس ہوا کہ بمشکل سات قدم کا فاصلہ اس کے اور میرے درمیان موجود ہے--- وہ سات قدم جو مجھ میں آگے بڑھانے یا اس کے پیچھے اٹھا کر جانے کی ہمت کبھی نہ ہوئی تھی- کھوج کا سوال انہی سات قدموں کا قیدی تھا-- جو چپ کے پر لگا کر ماہ و سال کے فلک پر اڑتا رہا- پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہر شے سے مجھ کو آشنا اور خود سے اجنبی کر دیا-

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں اعلیٰ نمبروں سے درجۂ دھم میں پہنچ چکا تھا- میں سکول کی ہاکی ٹیم کا کپتان بھی تھا اور ہیڈ بوائے بھی- جشنِ بہاراں کے نام پر سکولوں میں کھیلوں کے مقابلے منعقد کروائے جا رہے تھے--- میں ہر مقابلہ جیت کر سکول کا نام روشن کرتا آ رہا تھا جس کے باعث سکول میں اساتذہ سے لے کر ہیڈ ماسٹر تک سب مجھ پر کثرت سے مہربان تھے--- ایک دن سکول سے واپسی پر کینو کے باغوں سے کچھ آگے دوسرے سکول کی مخالف ٹیم کے کچھ شرارتی لڑکوں نے میرا راستہ روک لیا-- اور

لڑنے بھڑنے لگے۔۔۔ایک لڑکے نے میرا گریبان پکڑنا چاہا، میں نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ پشت کے بل گر گیا۔۔۔ دوسرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میرے سر میں ہاکی کا وار کرتے ہوئے مجھے گالی دی۔ طیش میں ،میں نے زمین سے پتھر اٹھا کر اسے مارنا چاہا ہی تھا کہ اچانک سامنے وہ آ کھڑا ہوا۔۔ اسے دیکھ کر میرا ہاتھ ہوا میں ہی ساکت ہو گیا۔۔۔ سر کا خون چہرے پر لکیر بناتا زمین پر گر رہا تھا اور میرا دل مجھ میں۔۔۔

"جھگڑتا کیوں ہے؟"

"انھوں نے مجھے گالی دی ہے"۔ میرے منہ سے لفظ کیسے نکلے مجھے خود بھی خبر نہیں۔

"ملامت پہ لڑتے ہو، بھلا ملامت پہ کیا لڑنا؟ فقیر کی غذا تو ہے ہی ملامت اس سے بڑی کوئی چیز نہیں ،مرشد کا فرمان یاد رکھنا"

"مطلب؟"

اللہ جانے مجھ میں کون بولا۔۔۔

"نہ سائیاں نہ۔ مرشد کی بارگاہ میں سوال نہیں ہوتے۔ نہ انکار نہ، استفسار، نہ تردید نہ تکرار، مرشد کی بارگاہ کی خیر ہو یہ عجب دربار ہے یہاں سینہ چاک بھی خود کرنا پڑتا ہے اور رفو بھی خود! کبھی سوئی کو دیکھا ہے دھاگے کے سامنے سوئی کتنی چھوٹی ہوتی ہے مگر اس کا دھاگے سے رشتہ ناکے کے سبب جڑتا ہے، ناکہ نہ ہو تو سوئی کچھ نہیں، یہ جو ننھا سا شگاف ہے نا یہی ملامت ہے جو اس کے ذرہ بھر وجود کو کسی قابل بناتا ہے، یہ نہ ہو تو کانٹا اور سوئی ایک برابر، ملامت میں عزت ہے، ملامت مٹی میں ملاتی ہے تو ہی مٹی کو مٹی کی حقیقت سمجھ آتی ہے، فانی فنا سے آشنا ہو کر بقا کے جھوٹے دائرے سے نکلتا ہے، یہ "میں" کا تاج گراتی ہے جب تک وہ نہ گرے گردن میں لچک نہیں آتی، سر نہیں جھکتا اور جو ملامت سہہ جاتا وہی سر جھکانے کی رمز پا جاتا ہے۔ یاد رکھنا! جو رمز پا جاتا ہے وہ ہی معشوق کی تختی کا سنہرا حرف ہو جاتا ہے۔۔۔۔ جھکے سر کو اٹھا دیکھتا ہے تو جا چوٹ سہنی سیکھ۔۔۔۔ سائیاں!!!"

لڑکے کب کے جا چکے تھے مگر میرے لیے صدیاں رکی ہوئی تھیں۔

"یہ عرشِ عشق ہے اور خون عشق کی زکوٰۃ ہوتا ہے، کبھی آنکھ سے بہتا ہے اور کبھی رگ رگ سے ،جب کبھی بہنے لگے تو بہنے دینا چاہیے۔ شام رنگ سے نہ ڈرنا۔"

اس نے آگے بڑھ گرم مٹی کو اٹھا کر زخم پر لگاتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے مجھے سمجھ آتی کہ اس نے کہا کیا ہے۔ وہ اچانک مڑا اور تیزی سے سکول والے رستے کا موڑ مڑ گیا۔۔۔ جبکہ میں سوچتا رہ گیا کہ "سائیں نے "مجھے۔۔۔ "سائیاں" کیوں کہہ دیا۔۔۔ میرے نام سے کیوں نہیں پکارا؟؟؟

کیا جیسے مجھے اس کے نام کا پتا نہیں اسے بھی میرا معلوم نہیں؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میں نے اپنے خیال کو خود ہی رد کیا، مجھے

سوال نہیں کرنا بھی تو وہ کہہ گیا تھا۔ یہ میرا اُس سے روبرو پہلا مکالمہ تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ نے سینے کا پنجرہ توڑا تو میں نے بستہ اٹھا کر گھر والے رستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

شاید دور کہیں وقت مسکرا دیا تھا۔

یہ میری روح پر پہلی ضرب تھی۔ میں ”خاور شاہ“

عرف ”کاکا“ اس رات پہروں سجدے میں رویا۔

میں ”دسویں کا نتیجہ آیا تو میں نے سکول میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری لیاقت کو جانتے ہوئے ابا کو مجھے شہر کے بڑے کالج میں داخل کروانے کا مشورہ دیا جسے ابا نے بلا چوں چراں مان لیا اور یوں گاؤں سے میں شہر آ بسا۔ سالوں کو پر لگے اور وہ اڑتے گئے۔ مجھے شہر آئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ جب ابا دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے اور اماں نے بھی پیچھے فقط دو دن ہی مشکل سے گزارے۔ ابا کے سوم کے ختم والے دن مغرب کے بعد وہ بھی ابا کے پیچھے چل دیں۔ موت اپنے کام سے کام رکھنے والی چپ چاپ اماں کی گوڑھی محبت کا راز کھول گئی تھی۔ سچ کہا تھا بلھے شاہ نے ”کون دلاں دیاں جانے ھُو“۔ محبت کرنے والے بھی سراپا معجزہ ہوتے ہیں۔ سانجھی محبتوں والوں کے دل بھی یقیناً سانجھ میں دھڑکتے ہیں۔ بہنیں اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ گاؤں کے خالی گھر سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ بہنوں کی چاہ تھی کہ میں سہرا باندھوں مگر میرے دل میں مجھے دور تک اس خواہش پہ کوئی رنگ چھلکتا نظر نہ آیا۔ اک عجب بے رنگی تھی جو سکوت میں ڈھل کر مجھے بیقرار رکھتی تھی۔ نہ کوئی سوال تھا نہ جواب کی فکر مگر تہہ میں چھپی ہوئی کچھ باتیں تھیں جن کا حجاب بے چین کیے رکھتا اور اس قدر بے چین کہ میں نے خود ہی یہ طے کر لیا تھا کہ بے تابیوں کو ٹھہراؤ کہیں ہے ہی نہیں۔۔۔ قیام شاید اب مستقبل بعید کی گود میں نومولود کی طرح آنکھیں موندے اپنے آپ سے بے نیاز تھا۔ خوابوں میں بھی اکثر میں خود کو محوِ سفر دیکھتا، ایک طویل رستہ جس پہ میں چلتا ہی جاتا ہوں، انھی دنوں ایک دوست نے ولایت بلانے کی فرمائش کی تو قدم اپنے آپ ہی ان دیکھی دنیا دیکھنے کو مچل اُٹھے، یوں ہجرت میرے دامن سے لپٹ گئی۔ اب مجھے چالیس کا سن لگ چکا تھا۔ چودہ سال ولایت گزار کر پچھلے ہفتے ہی میں وطن لوٹا تھا، جانے اسے کس نے میری آمد کی خبر دی تھی، پورے چوبیس برس بعد وہ ایک بار پھر میرے روبرو تھا۔ میری نظریں زمین کے سینے میں گڑی تھیں اور سماعتیں اس کی آواز کے سامنے حسب سابق جھکی تھیں جن کے قلب پر حرف حرف کسی مقدس صحیفے کی طرح نازل ہو رہا تھا۔

”پلٹ آیا ہے تو اب پلٹ ہی آ سائیاں!!!“

"کیا مطلب؟" آج پھر میری زبان بے ساختہ لڑکھڑائی۔ میں تو چپ تھا پھر یہ کون بولا؟؟

"سمے نے اس گٹھڑی کو کھولا ہی نہیں تو میں تمھیں مطلب کیسے بتاؤں؟ میرے ہاتھ تو ٹوٹے سوت کے چند ٹکڑے ہیں تم وہی لے لو۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا!!!!! اندر تپش لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور پسینہ پیشانی سے پھوٹ نکلا تھا۔

"اپنی نقدی سنبھال، مت سوچ کون کس کا مخبر ہے؟ یہ دیکھ کون کتنا طلبگار ہے، جیسے اندھیرے کے راز روشنی نہیں جانتی ایسے ہی اجالوں کی رمز تاریکی نہیں سمجھتی اس کے باوجود یہ جو اندھیرا ہے نا یہ سب جانتا ہے مگر کہتا کچھ نہیں، گہری اماوس رات کی طرح جس کی ہزاروں بند آنکھیں پسِ دیوار دیکھتیں تو سب کچھ ہے مگر کہتیں کچھ بھی نہیں، اندھیروں کی اپنی زبان ہوتی ہے جسے اندھیرے ہی سمجھتے ہیں اور جب یہ اک دوجے کی بولی سمجھ لیتے ہیں تو پھر ان کے بطن سے سویرے پھوٹنے لگتے ہیں، ہم بھی اندھیرے کے ہیولے ہیں اپنی ہی بولی سے انجان ہیولے، ابھی ہمیں بول سیکھنے ہیں، جب تک بول نہ ہوں بولا نہیں جاتا-- بول ڈھونڈ منترا۔"

"منترا؟"

میں اور اس کا منتر، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اچانک میں نے سر اٹھایا تو آنکھیں چار ہوئیں۔

آنکھ کا محور آنکھ ہوتی ہے۔ آنکھ، آنکھ میں گڑ جائے تو بینائی طواف میں مگن ہو جاتی ہے، مگر یہ بھید کوئی کیا جانے، جانے بھی تو کیسے جانے؟

اُس کا انگ انگ بولتی زبان تھا اور میرا تن من سنتے کان۔ شام کب ڈھلی، کب رات آئی اور کب رات کے بطن سے صبحِ صادق کا اجالا پھوٹا، گھڑیوں کا حساب کسے یاد؟

رکوع میں جھکی آنکھوں کو اذنِ سجدہ مل گیا تھا۔ سفر تمام ہوا تھا یا آغاز ہوا تھا کون بتاتا؟

روح معدوم ہوئی تھی یا معلوم سے ملاقات ہوئی تھی، کون کیا کہہ سکتا ہے---- کائنات کے اندر اور باہر نادیدہ پہیہ اپنی طے شدہ رفتار سے گھوم رہا تھا۔ کسی صاحبِ نطق کی ندا بازگشت میں ڈھل کر ماحول کے اسرار کو بڑھا رہی تھی۔ میں بوجھل قدموں سے اٹھا، سر اٹھنے سے اور ہاتھ سنگ اٹھانے سے قاصر تھا۔ صدائے دمادم کا عصا پکڑے میں چلتا جا رہا تھا۔ عین اس وقت جب موذن نے گلدستۂ اذان پر اللہ اکبر کہا میں نے اس بستی میں پہلا قدم رکھا جہاں سب کے لیے میں اجنبی تھا۔ کچی چاردیواری سے کسی نومولود کے رونے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

ادب کے ایوانوں میں

اور ہماری کہانی کا راوی گارے، پانی، کیچڑ بھری دلدلوں سے بچتا، ہانپتا کانپتا پہنچا اور دالان پہ ہی ڈھے گیا۔ اس کی آواز میں خوف، پچھتاوے، ماضی کی پرچھائیاں اور خدشے تھے اور ان خدشوں کے بیچ کہیں کوئی ناقابلِ فہم طمانیت سانس لیتی تھی۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا "بڈھا دریا بپھر گیا ہے، وہ جو سوکھا پڑا تھا، کہنے والے کہتے تھے مر گیا ہے۔ گارے اور سیوریج کا ڈھیر رہ گیا ہے بس، کہانی ختم، پیسہ ہضم، یہاں بستیاں بساؤ، نیا شہر بناؤ، تب بھی میں کہتا تھا، او ظالمو دریا اور ندیاں اپنے راستے بھولتے نہیں ہیں، یہ اپنا راستہ دیکھنے ضرور آیا کرتے ہیں۔ مگر مجھ بڈھے کی کون سنتا ہے، میرے بڑے لڑکے نے وہاں پلاٹ خریدا تھا اور اب اُس ٹاؤن کا بورڈ پانی میں ڈوبا شرمندہ کھڑا ہے اور میری آنکھیں دور تک خواب دیکھنے لگتی ہیں کہ اس کھڑے پانی میں جو درخت سلامت کھڑے رہے ان کے بیجوں سے اس زرخیز مٹی میں اور شجر، جھاڑیاں، سبزہ، گل اگ آئے گا، یہاں پرندے پھر سے اپنا آشیانہ بنائیں گے اور ہوا کی کثافت کم ہو جائے گی، میں یہ خواب دیکھتا ہوں اور دیر تک مسکراتا ہوں، میرے بچے مجھے پاگل سمجھتے ہیں، خاص طور پر میرا بڑا بیٹا غصے سے مجھے گھورتا ہے جیسے نگل جائے گا اور چیختا ہے "ابا تو کس قدر خودغرض ہے، کیا تو خوش ہے کہ میری یہ رقم ڈوب گئی، تو اس بات پر خوش ہے کہ تیری بات پوری ہو گئی، اور تیری انا کا غبارہ پھول گیا"، مگر زرا دیکھ تو سہی کہ دنیا کا کتنا نقصان ہو گیا، اپنا دیس ہی نہیں سرحد پار بھی لوگ ڈوب گئے، مر گئے، برباد ہو گئے ابا، عمر بھر کی پونجی لٹ گئی اور تو جو درختوں اور پرندوں کے ہجر کے گیت گاتا ہے، اُن کے کٹ جانے، اُڑ جائے، خفا ہو جانے کو محسوس کرتا ہے تو لوگ ڈوب گئے، تو خلقِ خدا کا یہ دکھ تجھے محسوس کیوں نہیں ہوتا؟"

راوی نے میری جانب اپنی بنجر آنکھوں سے دیکھا "بی بی! میں یہ سب کو کیسے بتاؤں کہ جو پنچھی روٹھنے پہ، درختوں کے

سمیعہ کرن

کٹنے پہ، دریاؤں کے راستے پہ بنی آبادیوں پہ روتا ہو، دکھی ہوتا ہو، اُس کو بھلا اپنے ارد گرد پھیلی یہ تباہی، یہ دُکھ بھری کہانیاں کیسے نہیں رلائیں گی؟ بی بی... بڈھا دریا پھر سے جوان ہو گیا ہے، اپنی جوانی اور مستی پہ ہے، اپنے راستے اور اپنی زمین واپس لے رہا ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اُس کے پانی واپس آنے پر خوشیاں مناؤں یا پھر اس کے ساتھ بہہ کر آنے والی خونچکاں کہانیوں کو دیکھ کر روؤوں؟" وہ لگاتار مجھ سے استفسار کر رہا تھا اور تا حال اُس کے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

اُس نے ایک بار پھر مجھ سے جب پوچھا "بی بی جی آپ بتایئے، جب میرے بچے مجھ سے ایسے عجیب و غریب سوال پوچھتے ہیں تو میں اُن کو کیا جواب دوں؟ کیا آپ جیسے لوگوں نے دریاؤں کی کہانیاں لکھی ہیں؟ وہ کہانیاں میں اپنے بچوں کو سنا سکوں؟ میں نے حلق میں آیا تھوک نگل کر بمشکل اُس سے پوچھا" کہانیاں، زندگی کی سب کہانیاں تو دریاؤں کے کنارے سے ہی شروع ہوتی ہیں، دریا بہت کہانیاں سناتے ہیں اور بہت کہانیوں کو جنم دیتے ہیں، وہ سوہنی کمہارن اپنے مہینوال کو چناب کنارے سے ہی تو ملنے---"

راوی نے اپنے کیچڑ بھرے جوتے اتارتے ہوئے اپنے میلے رومال کو نیچے پھینکتے ہوئے مجھے غصے سے ٹوکا "بی بی! اسوقت جب ہر طرف دریا منہ کو چڑھے ہوئے ہیں - آفتیں، انسانوں کی اپنی پیدا کی آفتیں اور بحران اس کو نگلنے کو بے تاب ہیں آپ کو دریا کنارے پریم کہانیاں سوجھتی ہیں، کیا آپ کو کچھ نظر نہیں آتا؟

میں نے مجرمانہ انداز سے سر جھکا لیا اور پوچھا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

بی بی- یہ دریا کے ساتھ جو کسی زینب، عائشہ یا مختاراں یا بسنت کور کا سارا داج بہہ کر غارت ہو گیا یا پھر کھڑی فصلوں میں چھپے رنگیلے خواب لٹ گئے اور اب اناج، سبزی کی منڈیوں میں جو گھپلے ہوں گے مرے کو مارے شاہ مدار کے مترادف مہنگائی کا طوفان آئے گا، قلت پیدا کی جائے گی، اپنے نوازے جائیں گے، امیر مزید امیر ہو جائے گا یہ کہانیاں کہاں درج ہوئی ہیں؟

بی بی! پہاڑوں کے سینے پہ کیلوں کی طرح پیوستہ درخت نہیں پورے جنگل کاٹ کر اُنہیں بالکل برہنہ کر دیا گیا ہے کہ وہ شرم سے اپنا چہرہ چھپاتے پھرتے ہیں - ان جنگلوں میں جو جانور، جو پرندے مقیم تھے وہ سب ہجرتوں پہ مجبور ہو گئے، یہ ہجرت کہیں رقم ہوئی ہے کیا؟ ان جنگلوں کی کٹائی کے پیچھے محکمہ جنگلات مقامی آبادی کے ساتھ ساتھ پوری طرح ملوث نہیں آلودہ ہے، کیسے اس لکڑی کو دریاؤں کے سپرد کر کے کس مہارت سے چوری اور ڈاکہ ڈالا جاتا ہے؟ درختوں کے کٹنے سے درجہ حرارت

بڑھا ہے، پانی کو پہاڑوں سے روکنے کا سلسلہ نہیں رہا، یہ چوری کی واردات کس نے لکھی ہے؟

بی بی! انسان نے صنعت و حرفت اور شہری ترقی کے نام پہ موت خریدی ہے، جنگ مسلط کی ہے، ہتھیار بنائے ہیں، ایسی مشینیں بنائی ہیں جو لگاتار اس کے ماحول کا درجہ حرارت بڑھا رہی ہیں اور یہ گولا، یہ کرہ، اس پر رہنے والی دوسری ہر مخلوق اس انسان سے بہت پریشان ہے کہ اس کی کرنی کا عذاب اُنہیں بھی بھگتنا پڑتا ہے!

ہاں بی بی! آپ دیکھیں جب گلیشیرز پھٹتے ہیں، جب جنگل اُجڑتے ہیں، جب آسمانوں سے پورا دریا کلاوڈ برسٹ کے نام پر برس جاتا ہے تو کیا آپ نے کبھی سوچا کہ اس علاقے کے چھوٹے بڑے جانور، حشرات، چرند پرند سمیت معصوم انسانوں کے، ان پہ کیا گزرتی ہوگی؟ کتنی پریم کہانیاں وقت سے پہلے مرجاتی ہوں گی، کتنے ہنستے بستے گھر، ان میں کھیلنے والے معصوم بچے سو جاتے ہوں گے، کتنے سکول بھوت بنگلے بن جاتے ہوں گے، وہ سڑکیں بہہ جاتی ہوں گی جو دور دیس میں بسنے والوں کو ملواتی تھیں، کتنے بیمار ہسپتالوں تک پہنچ نہیں پاتے ہوں گے- یہ کہانیاں کون لکھے گا؟ کب لکھے گا؟ اور میرے بچوں تک وہ کیسے پہنچیں گی؟

بی بی! میرے بچوں کو یہ کہانی کون سنائے گا کہ اپنی کرنی کا بھوگ ہمیں کاٹنا ہوگا - یہ درخت بھی تو مخلوق ہیں کیا انکا خالق ہم سے انکا انتقام نہیں لے گا؟ ہماری قسمت میں ایسی نالائق حکومتیں اس لیے آتی ہیں کہ ہم بالکل ان جیسے ہیں، اب ہم پر مزید قرضے بڑھیں گے، جگ ہنسائی ہوگی، ہمارا مولوی دریاؤں کے کنارے قرآن پڑھتا ہے جیسے برہمن اپنے اسلوک پڑھتے ہیں مگر دریا یہ زبان کب سمجھتے ہیں - طاقت کے اس گھوڑے کو علاقے کی مناسبت سے سدھانا پڑتا ہے، کہیں بند بنا کر، کہیں جھیلیں، ڈیم بنا کر --- لیکن خیر کا یہ سبق یہ کہانی کوئی نہیں رقم کرتا- کیوں بی بی؟ آخر کیوں؟ ایسی کہانیاں کون لکھے گا مجھے جواب دیجیے؟

یہ سارے سوال جائز تھے، برحق تھے اور مجھے آخر کار انکا کوئی جواب تو دینا ہی تھا میں نے آہستہ سے کہا ”آپ سب سچ کہتے ہیں مگر جب یہ سب بربادی ہو رہی تھی اُس وقت ادب کے ایوانوں میں بھی بہت زلزلے بہت سیلاب آئے اور اُس کے نتیجے میں ادب کے ایوان کا مرکز اسکا کلیکس جو ادیب تھا اُس کی موت واقع ہوگئی، اب بس یہ ایوان اس کے نام پہ سجا ہے، یہاں روز رسمی کارروائیاں اور کانفرنسز ہوتی ہیں، سیلابی بستیوں کی طرح وہ لوگ نوازے جاتے ہیں جو قطعی نااہل ہیں- اس لیے جو کہانیاں آپ سننا چاہتے ہیں اُنہیں لکھنے والا کوئی نہیں-

☆☆☆☆☆

اپسرہ

ایک ادبی تقریب میں شرکت کے بعد جب میں اپنے ضلع کے لیے مسافر بس میں سوار ہوا تو بس میں کچھ سواریاں موجود تھیں اور باقی بس خالی نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک بڑی 48 سیٹر بس تھی اور ہر ایک سواری مختلف سیٹوں پر بکھری ہوئی موجود تھی۔ میں جس راؤ میں آ کر جس سیٹ پر بیٹھ گیا وہاں کوئی موجود نہیں تھا اور میں جوتے اتار کر آرام سے کشادہ ہو کر ٹیک کے سہارے دراز ہو گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ایک سٹیشن سے دو نوجوان بس میں سوار ہوئے جو شکل سے ملازمت پیشہ اور پڑھے لکھے لگتے تھے۔ وہ دونوں نوجوان میری سیٹ سے پچھلی سیٹ پر خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک قریبی غیر معروف سٹیشن سے ایک خوبصورت جوان لڑکی اور اسکے ساتھ ایک دراز قد نوجوان لڑکا سوار ہوئے اور ان دو نوجوانوں کی پچھلی سیٹ پر بڑے نرالے انداز میں بیٹھ گئے۔ میں کیونکہ سیٹ پر سامنے کے بجائے گلی کی جانب منہ کر کے آلتی پالتی کے انداز میں بیٹھا تھا۔ اس لیے سوار ہونے والا یہ نوجوان جوڑا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے سوار ہونے کے بعد اگرچہ میری مکمل توجہ اس خوب صورت نیلی آنکھوں والی لڑکی کی طرف ہو گئی مگر ان سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو نوجوان بھی اس کے حسن کے سحر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان نوجوانوں میں ایک کالی داڑھی اور بھرے ہوئے جسم کا مولوی ٹائپ جوان تھا اور دوسرا چھوٹی چھوٹی خشخشی ڈاڑھی باریک مونچھوں والا معقول جسم چاکلیٹی رنگ کا نوجوان تھا۔ چاکلیٹی رنگت والا نوجوان بار بار چہرہ پیچھے موڑ کر اس پری پیکر کو نگاہ بھر کر دیکھتا اور دل کی پیاس ٹھنڈی کرتا۔ اس

محمد شفیق

خوب صورت لڑکی کا سراپا کسی صورت میں بھی جنت کی حور سے کم نہ تھا۔ درمیانہ قد، نشیلی گہری کا جل بھری آنکھیں، سفید موتیے کی طرح چمکتے دانت، ناک ستواں، سفید مرمری رنگت، ہونٹ پتلے اور خمار سراپا جنت کی حور نظر آتی تھی۔ اس نوجوان لڑکی نے ایک پرانے ڈیزائن کا ہلکے بادامی رنگ کا برقعہ پہن رکھا تھا۔ مگر وہ اس برقعے کو منہ پر ڈالنے کی زحمت بالکل بھی نہیں کر رہی تھی اور اپنے ساتھ والے نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ نوجوان بھی کبھی اتنے مسافروں کی پروا کیے بغیر اپنا منہ پیچھے کر کے پیچھے بازو گزار کر اسے اپنے بازو کی ٹیک لگوا دیتا۔ ان دونوں کی شکل، گفتگو اور حرکات سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے یا قریبی رشتہ دار ہیں اور دوستی کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں یا گھر سے بھاگے ہوئے ہیں اور کسی محفوظ مقام کی جانب عازم سفر ہیں۔ لڑکی کبھی کبھی اپنے سر پر پہنا ہوا برقعہ بالکل اتار دیتی اور گوٹا کناری لگی اوڑھنی میں ملبوس رہ جاتی اور اس پیلی اوڑھنی میں اس کا روپ مزید لشکارے مارنے لگتا اور یوں لگتا جیسے آسمان سے کوئی پری اتر آئی ہے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے نوجوان بار بار اس پری پیکر کی طرف دیکھتے آپس میں کچھ بولتے اور پھر ہنسنے لگ جاتے۔ میرا منہ کیونکہ بغیر کسی کروٹ کے ان دونوں جوڑوں کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا اس لیے کئی بار ڈر بھی لگا کہ کہیں لڑکی کے ساتھ والا نوجوان ان دو اگلی سیٹ والے نوجوانوں سے لڑ نہ پڑے مگر حقیقت یہ تھی کہ اب اس مہ رخ کا دلنشین چہرہ میرے بھی دل میں اترتا جا رہا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دل کرتا تھا کہ بس اس پری وش کا دیدار ہوتا رہے۔ میری توجہ کے بعد لڑکوں کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ ہم تینوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں اور منزل ہماری پہنچ سے دور ہے۔ سفر کٹتا جا رہا تھا اور اپنے ضلعے میں واپسی کے لیے مجھے ایک سٹاپ کے بعد دوسری گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ آخر وہ سٹاپ آ گیا مگر اس وقت تک میری آنکھیں اور ان دو نوجوانوں کی آنکھیں مسلسل اس مرمری پیکر کا طواف کرتی رہیں۔ اگلے سٹاپ پر جب میں اترا اور میرے ساتھ کچھ اور سواریاں بھی اتریں تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ صرف وہ نوجوان اس سٹاپ پر اتر آئے بلکہ وہ نوجوان لڑکی اور اس کے ساتھ والا لڑکا بھی اسی سٹاپ پر گاڑی سے اتر آئے۔ اب اگلی منزل کے لئے میں گاڑی کا انتظار کرنے لگا اور وہ دو نوجوان بھی روڈ کے کنارے کھڑے ہو گئے جبکہ لڑکی اور لڑکا فٹ پاتھ سے پیچھے دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ لڑکے نے اس سٹیشن پر اتر کر اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ کچھ وقت کے بعد جب ہماری منزل کی طرف جانے والے گاڑی آئی تو میرے

سوار ہونے سے پہلے وہ نوجوان اور وہ لڑکا اور لڑکی بھی اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

جب میں اس گاڑی میں سوار ہوا تو ان دو لڑکوں جواب بھی لڑکا اور لڑکی کی سیٹ سے آگے والی سیٹ پر بیٹھے تھے مجھے آواز دی کہ آپ یہاں ہمارے ساتھ آ جائیں۔ میں بھی پیچھے تاج محل کے عکس کو دیکھتا ہوا ان کے ساتھ جا بیٹھا۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی اب میری نظریں بھی ان دو نوجوانوں کے ساتھ بار بار پچھلی سیٹ کی جانب مڑ جاتی تھیں اور پھر دوسرے مسافروں کے خیال سے جھک جاتی تھیں۔ کچھ سفر کے بعد لڑکی نے اب پھر برقعہ اپنے سر سے اتار دیا اور لڑکے نے بھی اب پھر ہار ہیں اس کے گلے میں ڈال دی تھیں۔ میں اپنی سیٹ پر سہما ہوا بیٹھا تھا اور بار بار لوگوں کی نظروں سے نظر بچا کر اس سنگِ مرمر کے بدن کو دیکھ بھی رہا تھا جبکہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے جوان نہ صرف مجھ سے بے تکلف ہو رہے تھے بلکہ مختلف اشعار اور چٹکلے سنا کر مجھے اپنا ہمنوا بھی بنا رہے تھے۔ اگرچہ ہم تینوں یہ بات اندر سے جانتے تھے کہ کس لالچ نے ہم کو اکٹھا کیا ہوا ہے۔ سفر انتہائی دلکش اور خوب صورت انداز سے گزر رہا تھا اور مجھے نہ صرف یہ جوان جوڑی کو دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا لڑکا بھی نہ جانے کیوں زہر لگ رہا تھا۔ بالآخر ہماری منزل سے پہلے چار پانچ کلومیٹر وہ لڑکا اور لڑکی ایک چھوٹے سٹیشن پر اتر گئے۔

ان کے اترنے کے وقت ہم تینوں کی سانسیں رکی ہوئی تھیں اور حیرانی بھی تھی کہ اب یہ بقیہ مختصر سفر کیسے طے ہوگا اور اس پری پیکر کی یاد کیسے بھلائی جا سکے گی۔ ان کے اترنے کے بعد میرے ساتھ بیٹھے ہوئے یہ نوجوان لڑکے بھی کافی فکر مند اور مایوس نظر آئے مگر جانے والوں کو کون روک سکتا ہے۔

میں اس جوان جوڑے کے اترنے کے وقت مکمل طور پر ان کی جانب متوجہ تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ اب آگے وہ کس جانب روانہ ہوتے ہیں۔ اب کیونکہ وہ گاڑی سے نیچے اتر چکے تھے اس لیے میں اب آسانی سے نیچے سڑک پر ان کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ دو نوجوان بھی اس جوڑے پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھے کہ یکا یک وہاں ایک موٹر سائیکل سوار پہنچا جس کی بے ترتیب بڑی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی باریک داڑھی اور کندھے پر سیاہ چادر ڈالی ہوئی تھی۔ برقعہ اس پری پیکر کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ساتھ والا نوجوان اسے موٹر سائیکل پر سوار ہونے کا کہہ رہا تھا اور اس نئے جوان کے ساتھ اسے موٹر سائیکل پر سوار کر کے وہ خود روڈ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور ان کے جانے پر ہاتھ سے انہیں بائے بائے کرنے لگا اور اس حیرانی میں ہمارے ڈرائیور نے بھی گاڑی روانہ کر دی۔

☆☆☆☆☆

میں فاختہ

باغ کی کھلی فضا میں قید خوب صورتی سے لبریز دو حسینائیں اپنے اپنے مسائل میں الجھی۔۔۔ دل میں ارمانوں کا جنازہ اٹھائے نرم قدم اٹھاتے بڑے درخت کے نیچے پڑے پیلے رنگ کے میز کی آغوش میں خود کو دبوچتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

ان میں چھوٹے قد کی نازک مزاج لڑکی ماتھے پر سخت شکن لیے نہ جانے اپنے موبائل سے کس کی کال کا بے صبری سے انتظار کرتے ہوئے سر کو جنبش دے رہی تھی۔۔۔۔ساتھ بیٹھی ساتھی اس کے نرم ہاتھوں کو چومتے ہوئے دلاسہ دینے کے سے انداز سے کہہ رہی تھی صبر کرو سب ٹھیک ہوگا۔۔۔۔مگر جیسے اسے تو پہلے سے الہام ہو رہا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔۔۔۔میں بے زبان بے دھیانی میں بھی اسے بڑے غور سے پڑھ پا رہی تھی۔۔۔مگر نہ جانے کیوں میں نے سارا کچھ چھوڑ کر اسے مکمل دیکھنا چاہا اور پھر جو ہوا وہ مجھ پر مسلط ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ آنکھوں کے بند ٹوٹنے کو تیاری ہی ہوتے کہ وہ سارے باغ کی تازگی کو اپنے لنگز میں بھرتے ہوئے خارج کر دیتی۔۔۔۔جس کے ساتھ ہی آنکھوں سے اترنے والا گرم سمندر واپسی کا رشتہ پکڑتا اور آنسوؤں کا سیلاب تھم جاتا۔۔۔۔

بہار کی ٹھنڈی ہوا اس کے جسم کو چھو کر گرم ہو رہی تھی۔۔۔۔مگر اس کے باوجود بھی اس کا جسم کانپ رہا تھا۔۔۔۔نہیں رکیے۔۔۔۔!! شاید میں غلط ہوں جسم نہیں دل کانپ رہا تھا۔۔۔۔

کچھ لمحے میں ساکت ہوں ہی دیکھتی رہی مگر جیسے ہی میں نے آنکھ جھپکی تو دیکھا کہ موبائل کے دوسری طرف سے آنے والی آواز اس کے کان کی نرم لو سے ٹکراتے ہوئے سماعت کے کاکلا تک پہنچی۔۔۔۔آنکھوں کی پتلیاں فضا میں لہراتے پتوں کو حیرت سے دیکھ رہیں تھیں جیسے وہ ان کے رقص سے جل رہی ہو۔۔۔۔درخت کے نیچے پڑے بینچ پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی اور کہہ رہی تھی نہیں میری بات سنو تمہیں غلط بتایا گیا ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔۔۔۔کہتے ہوئے لمبی سانس لی اور پھر سے بات دہرائی۔۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔۔۔۔تمہیں غلط فہمی ہوئی۔۔۔۔کہتے ہوئے پھر اسی کیفیت کا اثر چہرے

ماریہ انور

پر عیاں ہو جاتا......
ہوا کی تیزی سے خزاں کی لپیٹ میں آنے والے سوکھے پتے اسکے پیروں کو چھو کر گزر رہے تھے......
بینچ سے اٹھ کر وہ دھیمی ہونے والی بارش، پتوں کی چھنچھناہٹ، ہوا کے رقص، پرندوں کی پرواز اور مجھ سے اجازت طلب کیے بغیر مجھے گواہ بنا کر حیرت سے کہہ رہی تھی...... تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ مجھے درد نہیں ہوتا...... مگر ساتھ ہی آواز میں ذرا بھر کے لیے نرمی نے داخل ہونے کی ناکام کوشش کی اور وہ بولی ----
ہاں --- شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مجھے درد نہیں ہوتا --- مگر تمھیں پتا ہے درد کیوں نہیں ہوتا...... وہ آنکھیں میچ کر رخساروں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی...... ہاں سنو......
وجہ یہ ہے کہ مجھے احساسات بیان نہیں کرتے آتے...... اور جنھیں احساسات چھپانے کی لت لگی ہو نا انہیں باہر سے نظر آنے والا درد نہیں ہوتا...... اتنا کہتے ہی وہ زور زور سے رونے لگی...... اک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے آسمان اس کے برابر رونے کی کوشش میں بادلوں کو برسنے پر مجبور کر رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی بارش نے کچھ وقت کے لیے آنکھوں کے برابر برسنا شروع کر دیا...... میں نے بارش کا مشاہدہ کرتے ہوئے رونے والی کے بہت سے جذبات کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا...... مگر وہ کہہ رہی تھی...... تم نے مجھے تکلیف دی...... نفرت ہے مجھے تم سے...... اور وہ مسلسل کہے جا رہی تھی...... نفرت...... نفرت ہے مجھے...... شاید وہ جواباً محبت بھرے الفاظ سننے کی منتظر تھی کہ کال کٹ گئی...... نہیں...... شاید کاٹ دی گئی......
وہ حیرت زدہ آنکھوں سے فون کو تکے جا رہی تھی- چند لمحے سکتے میں ڈوبی آنکھوں سے میں اسے تکتی رہی...... مگر کہیں میرے شعور میں یہ بات چل رہی تھی کہ کاش جو سب کچھ میں نے دیکھا وہ سب دوسری طرف سے بات کرنے والے ظالم شخص نے بھی دیکھا ہوتا...... وہ لمبے قدم بھرتے ہوئے اپنی دوست کی طرف لپکی ہی تھی کہ اسے سامنے پا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا بلاک کر دو اسے...... میرے لیے حیرت زدہ بات یہ تھی کہ وہ بڑے درخت کے نیچے پڑے پیلے رنگ کے اسی میز کی آغوش میں جا کر خود کو دوبارہ سمیٹ چکی تھی......
چہرے پر چند لمحوں کا حیرت زدہ سکون دیکھ کر میں لرز سی گئی...... چاروں طرف ہر چیز ساکت، سہمی اور رکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی...... ہوا کی زد میں آکر پتے آپس میں الجھ پڑے تھے...... آسمان سرد آنسو بہا رہا تھا......
پرندے جو اپنے آشیانوں کی طرف رواں تھے

رکے ہوئے محسوس ہوئے۔ گھاس پر گرتے گرم آنسو ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے...... دوست کے سینے سے لگ کر نہ جانے وہ کیا سے کیا کہہ گئی......لفظ اپنا وجود کھو رہے تھے۔

میں دور سے ٹھیک سن تو نہ سکی مگر شاید وہ ماضی کی خوب صورت تلخ یادوں کو دہرا رہی تھی...... جسے سن کر مجھے اپنے تھوڑی دیر پہلے کیے جانے والے غلط مشاہدے پر شدید نفرت ہوتی محسوس ہوئی کہ میں نے اسے بغیر جانے، بغیر سمجھے ظالم شخص بول دیا جبکہ میں کچھ نہیں جانتی اس کے بارے میں......

خیر آنسو صاف کرتی ہاتھ میں رومال پکڑے دوست ہمدردی سے، محبت سے، پیار سے اس کا کندھا دبا رہی تھی......اٹھو چلو گھر چلتے ہیں دوست نے کہا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو......

کون سا گھر......؟

کہاں ہے میرا گھر......؟؟

نہیں ہے میرا کوئی گھر نہیں......!!

دوست کے ہاتھوں میں دبوچے ہوئے اپنے ہاتھوں کو آزاد کروا کے وہ سر ہاتھوں میں لیے زور زور سے رونے لگی اور مجھے سنائی نہ دیا کہ اسے دنیا کی ہر چیز، ہر شخص سے نفرت محسوس ہو رہی ہے...... ہر وہ چیز جس سے اسے کبھی شدید محبت تھی......

اٹھو چلو--- ہوش کرو ہمیں چلنا ہے...... تمہارے گھر میں سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے...... دوست نے کہتے ہوئے مشکل سے اٹھایا...... .بڑی محنت سے قدموں پر زور دیتے ہوئے قدم اٹھائے اور چل پڑی...... میں نے شکر ادا کیا اور زیر لب کہا خدا اس کی حفاظت کرے......میں ابھی دعا کر ہی رہی تھی کہ...... .میں نے دیکھا وہ چلنے کی ہمت نہ ہونے کے باعث پھر سے درخت کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئی...... کچھ دیر پھر آنسو بہانے کے بعد وہ دوست کے کندھے کا سہارا لے کر اپنی منزل کی طرف بڑھ گئی...... مجھے وہ جاتی نظر آئی...... وہ جا چکی تھی......مگر باغ کی ہر چیز جو ساکت، بے رنگ، بدمزہ ہو گئی تھی شور مچاتے ہوئے سناٹے کے ساتھ پھر سے رواں ہوئی...... درخت کی چھال کا سینہ چاک کر کے نکلنے والی نازک ٹہنی پر بیٹھی میں فاختہ......اس کے لیے کچھ نہ کر سکی مگر افسوس وہ اپنے سارے دکھ مجھے زبردستی تھما گئی......اور میں کچھ نہ کر سکی...... میں فاختہ......دل پر جبر کیے سانس روکے درخت کی کمزور ٹہنی پر بیٹھی رہ گئی......اور وہ چلی گئی...... !!!!

☆☆☆☆☆

”آفت زدہ“

شدید طوفان اور بارش نے ہر طرف جل تھل کر رکھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔

امیر تو اس موسم کو انجوائے کر رہے تھے لیکن غریبوں کے لیے آزمائش منتظر تھی۔ غیر معمولی بارشوں سے نشیبی علاقے ڈوب جاتے تھے۔ کمزور دیواروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔ اچانک تیز آواز سنائی دی۔ ”اماں باہر والی دیوار گر گئی ہے“۔ صغراں کی جواں سال بیٹی فاطمہ بھاگی ہوئی اندر آئی۔ ”اب کیا ہوگا اماں“ ”رب وارث ہے دھیے“ صغراں نے دلاسہ دیا۔ بیٹی کو تو دلاسہ دے دیا لیکن خود وہ پریشان ہوگئی کس سے مدد مانگوں وہ سوچنے لگی۔ وہ گاؤں میں محنت مزدوری کرتی تھی۔ بیٹی جوان تھی اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی تمنا تھی۔ لیکن غریب کے گھر رشتہ لینے کون آتا ہے۔ بہت سوچ بچار کر کے صغراں نے اپنے ماموں زاد بھائی کو فون لگایا۔ بار بار فون کرنے پر بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔ ہمت کر کے صغراں نے صبح شہر جانے کا سوچا۔

”سب تیاریاں مکمل ہیں“۔ ”جی جناب۔ آج یتیم خانے کے افتتاح کی تقریب تھی۔ سیٹھ دانش کا شمار شہر کے بڑے کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔ وہ سیلف میڈ آدمی تھے۔ چالیس سال محنت کے بعد اس مقام پر پہنچے تھے۔ ان کی شخصیت میں بلا کا تصنع اور ریاکاری تھی۔ انھیں اپنی واہ واہ بہت عزیز تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا بچپن ناداری میں گزرا تھا۔ تقریب میں شہر کی ان شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جو کہ تشہیر میں معاون ثابت ہو سکتی تھی کچھ میڈیا والے بھی مدعو تھے۔ تقریب گہما گہمی اور زوروں شوروں سے جاری تھی۔

صغراں بے چاری بس میں دھکے کھاتی ماموں زاد بھائی سیٹھ دانش کے گھر پہنچی تو گھر پر صرف گارڈ تھا۔ وہ بے چاری بھوکی پیاسی بیٹھ کے انتظار کرنے لگی۔ تین گھنٹے بعد تقریب ختم ہوئی اور سیٹھ صاحب گھر واپس آئے۔ صغراں کو دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ”تم کیوں آئی ہو“۔ میں نے بہت فون کیے آپ نے نہیں اٹھائے میں بہت تکلیف میں ہوں۔ جوان بیٹی کا ساتھ ہے گھر کی دیوار گر گئی ہے اس کی مرمت کے لیے مجھے پیسے چاہیے۔

نادیہ عنبر لودھی

آپ کے علاوہ سب رشتہ دار غریب ہیں۔ اس لیے یہاں آگئی"۔ اتنے میں سیٹھ کا فون بجا "سر پچاس ہزار تو بہت کم ہیں اگر فنکشن کی ویڈیو ہر خبرنامہ میں چلانی ہے تو بیس ہزار مزید دیں"۔ مقامی ٹی وی چینل کا رپورٹر بولا۔ "ٹھیک ہے کل آکر لے جانا"۔ سیٹھ نے جواب دیا۔ "تم لوگ منہ اٹھا کر چلے آتے ہو۔ پیسے کیا درختوں پر لگے ہیں۔ پکڑو یہ پانچ ہزار اور جاؤ"۔ سیٹھ نے جیب سے بٹوا نکالا اور ایک نوٹ صغراں کے ہاتھ پر رکھا۔ صغراں بے چاری ڈر کے الٹے قدموں گیٹ سے نکلی اور بس سٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ ایک لاکھ کا خرچہ ہے اور یہ پانچ ہزار کا نوٹ۔ اس نے سوچا۔ بس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ خیرات بانٹنے ایک سخی آیا اس نے صغراں کو بھی ایک تھیلی پکڑا دی۔ صغراں نے چند نوالے کھائے اور باقی چاول بیٹی کے لیے رکھ لیے۔ اس کے روٹ کی بس آگئی وہ بھی سوار ہوگئی۔ اچانک شدید بارش شروع ہوگئی۔ بس منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ بس نے آدھی مسافت طے کی تھی کہ نشیبی علاقہ شروع ہوگیا۔ بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ تا حد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ بس پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی تھی ڈرائیور بس کو آہستہ سپیڈ سے چلا رہا تھا کہ اچانک ایک بڑا سیلابی ریلا آیا اور بس کو بہا لے گیا۔۔۔۔۔۔۔

فاطمہ صبح سے ماں کا راستہ تک رہی تھی رات اندھیرے اور مایوسی کو دامن میں سمیٹے اپنا سفر طے کر رہی تھی کہ صبح ہوگئی۔ بھوک سے نڈھال فاطمہ نے آٹا گوندھا اور روٹی پکا کر کھائی پھر وہ ہمسائے کے گھر گئی اور ہمسائے سے ماں کے جانے کی روداد بیان کی۔ "میں پتا کرتا ہوں تو فکر نہ کر"۔ دین محمد نے آس دلائی "ایسا کر یہیں بیٹھ جا میں پتا کر کے آتا ہوں"۔ "جی چاچا" فاطمہ بولی اور وہاں بیٹھ گئی۔ دین محمد پتا کرتا کراتا دو گھنٹے بعد لوٹا۔ "بیٹا تری ماں نہیں رہی۔ جس بس پر وہ سوار تھی وہ بس سیلابی ریلے میں بہہ گئی ہے" کسی کی لاش نہیں ملی اب تو صبر کر"۔ دین محمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ چاچا کی اس اطلاع نے فاطمہ پر قیامت توڑ دی۔ وہ بے چاری بالکل تنہا رہ گئی۔ کچھ دیر میں یہ خبر پھیل گئی اہل محلہ صغراں کے گھر پر جمع ہوگئے۔ سب افسردہ تھے۔ فاطمہ کے بدن میں جیسے کاٹو تو لہو ہی نہ تھا۔ افسوس کر کے آہستہ آہستہ ہمسائے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ صغراں کی لاش نہ مل سکی فاطمہ بدنصیب ماں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔ رات میں ایک ہمسائی فاطمہ کے گھر رک گئی۔ تین دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر سب اپنے

اپنے کاموں میں لگ گئے - یہ ہی دستور دنیا ہے مرنے والے کو لوگ بہت جلد بھلا دیتے ہیں لیکن زندہ فاطمہ کو بھی سب بھول گئے - فاطمہ نے سیٹھ دانش کا نمبر بار بار ملایا دوسری طرف سے نمبر بلاک کر دیا گیا - دن ڈھل گیا رات آگئی آج فاطمہ بالکل اکیلی تھی - صحن کی دیوار مسمار حالت میں تھی اور وہ بھی اندر سے مسمار ہی ہو چکی تھی - اندھیرا چھا گیا اور شدید بارش شروع ہو گئی اچانک بجلی چلی گئی - فاطمہ سٹور نما کمرے میں جا کر لیٹ گئی یہاں گھر کا کاٹھ کباڑ رکھا تھا ایک جھلنگا چارپائی اور پرانی سی پیٹی پڑی تھی وہ چارپائی پر پڑ گئی اور سو گئی - اچانک شور سے اس کی آنکھ کھل گئی - پپو کو ٹھوکر لگ گئی تھی - ”دھیان سے چل یار مروائے گا تو“ - پپو اپنے دوست فضل سے بولا - پپو اور فضل محلے کے اوباش لڑکے تھے - ان کے ہاتھوں میں موبائل تھے جس کی ٹارچ کی روشنی میں وہ گھر کی تلاشی لے رہے تھے - ”کہاں چھپی ہوئی ہے نظر نہیں آ رہی“ - فضل بولا ”یہیں کہیں ہو گی - ہے بڑی سوہنی - الہڑ مٹیار ہے“ - پپو نے کہا ان دونوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی فاطمہ کا خوف سے برا حال تھا - کمرے میں پپو داخل ہوا فاطمہ پر نظر پڑی اور بولا ”ارے یہ رہی - تو باہر چل کر اپنی باری کا انتظار کر میں آتا

ہوں“ - فضل باہر نکل گیا - پپو نے فاطمہ کو دبوچا اس کی عزت تار تار کی اور کمرے سے نکل گیا - فاطمہ سسکتی رہ گئی اس نے بہت منتیں کی لیکن بے سود - اب فضل کی باری آئی اس نے ہوس کی پیاس بجھائی اور وہ دونوں فاطمہ کے گھر سے نکل گئے - فاطمہ روتی سسکتی رہی - اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا - اسے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی - اتنے میں بجلی آ گئی فاطمہ نے جیسے تیسے کپڑے پہنے کہ اس کی نظر کونے میں رکھی رسی پر پڑی - غربت، مایوسی، مجبوری تنہائی اور عزت کی پامالی نے اس کی سوچنے سمجھنے کی حس کو مفلوج کر دیا - اس نے کمرے میں کونے میں پڑی ہوئی رسی اٹھائی اور پنکھے سے باندھ کر وہ رسی سے جھول گئی - صبح جب دین محمد کی بیوی فاطمہ کی خبر لینے اس کے گھر پہنچی تو پنکھے سے جھولتی ہوئی لاش دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی سارا محلہ اکٹھا ہو گیا - رش دیکھ کر فضل بھی فاطمہ کے گھر کی طرف چل پڑا اس نے فاطمہ کی لاش دیکھی تو سکون کا سانس لیا -

”چلو جان چھوٹی“ اس نے خود سے دل میں کہا - وہ پپو کو اطلاع دینے چل پڑا - فاطمہ کی موت کی خبر سن کر پپو خباثت سے بولا -

”مزا بہت آیا تھا ویسے تھی بڑی مست چیز“ - پھر دونوں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے -

☆☆☆☆☆☆

دل کے حاشے پر

طوبیٰ صدیقی

کمرا نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ننھے برقی قمقموں سے کی گئی سجاوٹ کمرے کو سحر انگیز بنا رہی تھیں۔ ٹیبل لیمپ کے گرد پھیلتی روشنی میں وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ نوٹ پیڈ کھولے خیال کو لفظوں کی صورت منتقل کر رہا تھا۔ وہ لفظ جو اس کی پہچان تھے، اس کی تنہائیوں کے ساتھی تھے اور وہی لفظ اس کے جینے کا مقصد بھی تھے۔

فریم لیس چشمے کے پیچھے سیاہ آنکھوں کی چمک اس کے جنون کو ظاہر کر رہی تھی۔ سامنے میز پر رکھے کلاک کی سوئیوں کی آواز گویا وقت کی تیزی کا اعلان کر رہی تھی۔

فون خاموشی سے میز پر رکھا وائبریٹ ہو رہا تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد جب اس نے فون دیکھا تو بیسیوں کالز اور میسجز قطار میں کھڑے تھے۔ ایک میسج میں اس کی تعریف و توصیف کے بعد اس سے انٹرویو کے لیے گزارش کی گئی تھی۔ اس کے بعد سے لاتعداد کالز دیکھ کر اس کا ٹھیک ٹھاک دماغ گھوم چکا تھا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے فون واپس رکھ دیا۔

کچھ دیر خود کو پُرسکون کرنے کے بعد وہ میلز چیک کر رہا تھا جبھی نئی ای میل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ ای میل زویا نامی لڑکی کی جانب سے تھی۔ لیپ ٹاپ اٹھا کے اس نے اپنے قریب کیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نئی ای میل کو پڑھنے لگا۔

ڈیر رائٹر! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے! آپ ہمیشہ اپنے قارئین کو کہانیاں سناتے ہیں آج ایک کہانی میں آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے عرض کروں گی ای میل مکمل پڑھیے گا، جواب دینے یا نہ دینے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے لیے میں آپ کو فورس نہیں کروں گی۔

کہانی کا آغاز کرتے ہیں...

''وہ کہتا ہے یہ سفید کورے کاغذ انسان کے بہترین ساتھی ہوتے ہیں۔ یہ رازوں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ان پنوں سے ایک بار دوستی کر کے دیکھو یہ تمہارا ہر دکھ، درد اپنے سینے میں دفن کرلیں گے۔ ہر وہ بات جو کسی انسان سے کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرو ان

پنوں کے سپرد کر کے پرسکون ہو جاؤ۔
ناول میں لکھی ان چند سطور نے پل بھر کو مجھے ٹھٹکنے پہ مجبور کیا۔ میں جو کم گو، فطرتاً خاموش مزاج، اور اپنے کام سے کام رکھنے والی طبیعت کے باعث گھر، خاندان، یا دوستوں کے ساتھ زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی اس مفید مشورے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

کہتے ہیں نا کہ اپنے دکھ، درد کہنا آسان نہیں ہوتا میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ ایک ہچکچاہٹ، ایک عجیب سا خوف تھا کہ کوئی پڑھ لے گا تو کیا سوچے گا؟ کسی کو میری کمزوری معلوم ہو گئی تو؟ کسی نے پڑھ کر مذاق بنایا تو؟ انہی باتوں کو سوچتے ہوئے میں نے کہانی کا اگلا پیراگراف پڑھنا شروع کیا تو میرے لب مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ میری سوچوں کا جواب اسی کردار کی زبانی موجود تھا۔

اگلے ہی دن میں نے مارکیٹ سے خوب چھان بین کے بعد ایک سیاہ مخملی جلد والی ڈائری خریدی جو میرے ذوق اور گمان کے مطابق تھی۔ تین حرفی کوڈ بار کے ذریعے لاک ہونے والی ڈائری نے میری تلاش مکمل کر دی تھی۔ گھر آ کے پرسکون سے انداز میں آج کا دن اور تاریخ کا اندراج کرنے کے بعد اپنا پہلا شکریہ خالق کائنات کے نام لکھا۔ تخیل کی آنکھ سے اس کردار کو دیکھا تو اس کی بازگشت اپنے اردگرد سنائی دینے لگی، اسی اثنا میں انگلیوں میں جنبش پیدا ہوئی اور لفظوں نے خود بخود ان سفید کاغذ پہ بکھرنا شروع کیا۔ شکرگزاری کے احساس تلے میں کافی دیر تک اس کردار کو لکھے گئے مختصر سے شکریہ کو تکتی رہی اور پھر جیسے یہ معمولات زندگی میں شامل ہو گیا۔

میں جو ہمیشہ ایک لڑکی کے نظریے سے کوئی بھی کہانی، ناول، افسانے پڑھتی تھی، لڑکی کے کردار کو آئیڈیلائز کرتی تھی اب پہلی بار ہیرو کے کردار کو دل کی آنکھوں سے پڑھا تھا۔ وجہ بھی خاص تھی کہ اس بار میرے نظریات ہیروئن کے بجائے ہیرو کے کردار سے میل کھاتے تھے۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی میری ڈائری کا ہر صفحہ اسی کے نام سے بھرتا گیا۔ کسی بھٹکے ہوئے جگنو کی طرح وہ میری زندگی میں آیا اور میری زندگی کو روشن کر گیا۔ اس کردار کی پسند، ناپسند، عادات، شخصیت اس قدر متاثر کن تھیں کہ اس تخیلاتی کردار کی باتیں میری زندگی میں عملی تفسیر بنتی گئیں۔

وہ کہتا ہے ماضی کی زنجیروں میں جکڑا انسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا اور میں اس کی بات

پڑھ کر سن ہوئی تھی، آنکھوں میں آئی نمی نے تیزی سے رخساروں تک کا سفر کیا تھا۔ ماضی چاہے کتنا دردناک ہو انسان کا اصل اس کا حال ہوتا ہے۔ اگلی سطر نے جیسے میرے آنسو چن لیے تھے۔ اور اس لمحے مجھے احساس ہوا اس کردار نے مجھے اپنا اسیر کرلیا ہے۔

محبت کی کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ محبت حاصل کرنے کا نام ہے بل کہ یہ تو فقط چاہے جانے کا نام ہے۔ ایک احساس ہے جو ہم اپنی کسی بھی پسندیدہ شے یا انسان کے لیے محسوس کرتے ہیں۔ اور میرے دل نے گواہی دی کہ ہاں میں بھی اس دلکش شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو چکی ہوں۔ نہ جانے کیسے وہ میری زندگی کا ایک اہم حصہ بنتا گیا۔ کہانی ابھی باقی تھی کہ میری زندگی میں مثبت تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ زندگی کو دیکھنے کا مثبت پہلو نظر آنے لگا۔ جو باتیں پہلے منفی محسوس ہوتی ہیں، اب ان میں ہی کہیں نا کہیں کوئی مثبت پہلو تلاش کرنا میری شخصیت کا حصہ بن گیا۔ اس تبدیلی کا اثر تھا کہ میں اس کردار کی محبت کے رنگ میں رنگتی گئی، گویا کوئی مصور اپنے تخیل کے کینوس پر اپنی چاہت کے رنگ بھر رہا ہو۔ وہ میرے اندر کے اندھیرے میں روشنی بن کر اترا تھا۔ مجھے اس نے جینا سکھایا، رکنا، سوچنا، برداشت کرنا اور یہاں تک کہ محبت کرنا بھی میں نے اسی سے سیکھا۔

وقت تیزی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا، میں جو اس کردار کی معیت میں مثبت نظریہ کی شاہراہ پہ قدم رکھ چکی تھی کہ پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوئی۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ نے کسی تخیلاتی کردار کی نہیں کسی جان دار کی سانسیں چھین لیں۔ کیا آپ جانتے ہیں، اُس کی موت کے بعد میں نے زندگی کو خود سے سوالیہ نشان کے طور پر دیکھا؟ کیا کرداروں کو یوں مرنا چاہیے، جب وہ جینے کا ہنر سکھا رہے ہوں؟“

اس ای میل کو پڑھ کر پہلے وہ حیران ہوا، حیرت سے تعجب اور تعجب سے افسردگی کے ساتھ آنکھیں موند گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ اس کردار کو قارئین نے محبت دی ہے لیکن اس لڑکی کے لفظوں سے چھلکتا محبت کا وہ انوکھا احساس اس کی آنکھیں نم کر گیا۔ کتنی ہی دیر وہ خالی الذہن کے ساتھ لیپ ٹاپ کی سکرین کو دیکھتا رہا جواب تاریک ہو چکی تھی۔ جوابی ای میل کے لیے ابھی اس کے پاس ذخیرہ الفاظ ختم ہو چکا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا جب وہ تین دن گزرنے کے باوجود بھی زویا کو جواب دینے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ وہ اسے امید

کی کوئی ایسی ڈور تھامنا چاہتا تھا جس کے سہارے اس لڑکی کو پھر سے اُٹھنے میں مدد ملے۔ اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور ای میل کو دوبارہ پڑھا۔ آنکھوں کے پردے پہ اس ہنستے مسکراتے، خوشیاں بکھیرتے، کردار کا عکس ابھرا، اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر بڑی پرسکون سی مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے اب مطمئن سے انداز میں میل ٹائپ کرنا شروع کی۔

ڈیئر زویا!

تمہاری ای میل پڑھ کر کچھ لمحوں کے لیے میں گنگ رہ گیا، مجھے اُمید نہیں تھی کہ کوئی اس قدر بھی اس کردار سے محبت کرے گا۔ میرا ماننا ہے کہ ایک لکھاری سے زیادہ اس کے تخلیق کردہ کرداروں سے کوئی بھی محبت نہیں کرسکتا لیکن جس طرح تم نے اس کردار کو سمجھا، پرکھا اور اپنی زندگی میں شامل کیا حقیقتاً میں نے پہلی بار اپنے کردار کو کسی اور کی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی ایسی آنکھ سے جو خواب بھی دیکھتی ہے اور محسوس بھی کرتی ہے۔ تمہاری باتوں میں جو سچائی تھی اور محبت کا جو احساس تھا اس نے مجھے حیران کردیا۔

تم نے لکھا، ''کیا کرداروں کو یوں مرنا چاہیے، جب وہ جینے کا ہنر سکھا رہے ہوں؟''

سچ کہوں تو میرا دل کہتا ہے، ''نہیں'' مگر بطور لکھاری، میرا فن کہتا ہے ''شاید ہاں'' کیوں کہ کبھی کبھی ہم کسی کی زندگی میں محدود مدت کے لیے آتے ہیں پوری زندگی ساتھ گزارنے کے لیے نہیں...

اور کبھی کبھی کچھ کردار مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ شاید وہ کردار تمہارے آس پاس ہو جب تم اپنا راستہ بھٹک گئی ہو، یا جب تمہارا دل بوجھل ہو، یا تم کسی مقام پر خود کو تنہا محسوس کرو تو وہ کردار تمہیں تمہارے اندر، تمہاری سوچ میں، تمہارے تخیل میں اور تمہارے عمل میں ملے گا۔ اس کردار کا کہانی میں اتنا ہی کام تھا کہ وہ تم، اور تم جیسے کئی پڑھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ وہ چراغ کی مانند تھا، روشنی بانٹنے آیا، جل کر نہیں بجھا، بلکہ کئی اور دیے روشن کر گیا۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ میری لکھی کہانی کی بدولت کسی کی زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آئی۔ میں حیران بھی ہوں، اور شکر گزار بھی۔

تمہارے انمول احساسات، تمہاری بے ساختہ سچائی اور خاموش محبت کا بے حد شکریہ!

خلوص کے ساتھ

زاویار حسن

☆☆☆☆☆

تختی

صہیب اکرام

بدبودار، اجڑی اور زندگی کی رمق سے کوسوں دور اس گلی سے گزرتے ہوئے ہارون چاروں طرف حیرانی تجسس اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

ہارون ادب کا طالب علم تھا قسمت کی بات ہے کہ ذہین وفطین تھا اور ساتھ تہذیب وتمدن اور ثقافت سے محبت کرنے والا انسان تھا۔

وہ کہانیوں کی تلاش میں شہر کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں نکل جایا کرتا تھا۔ وہ اس شہر پُراسرار کی ایک ایک اینٹ کا دلدادہ تھا۔ چلتے چلتے وہ اس عجیب گلی میں نکل آیا تھا۔

آج موسم بھی معمول سے زیادہ سرد تھا فضا میں خنکی کی لہر پہلے سے بڑھ گئی تھی وہ لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا مگر سردی رگ وپے میں سرایت کر رہی تھی۔ اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا تو اس سرد شام میں گرم لحاف میں گھس کر چائے پیتا رہتا اور کتاب تھامے کسی اور دنیا میں نکل جاتا۔ لیکن وہ تنہا ان گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔

اس گلی کو دیکھ کر وہ پہلے ٹھٹک گیا اس کا دل یہیں اٹک گیا اور وہ اس گلی میں داخل ہوا اور چلنے لگا۔

شام کی ڈور رات تھام رہی تھی۔ اجالے پر سائے اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے تھے۔ سفیدی اوجھل ہو رہی اور اندھیرا غالب آنے کو تھا۔

گلی میں کئی بوسیدہ مکان تھے جو شاید گھر کا درجہ مدت سے کھو چکے تھے یہاں سے مکین زندگی کی دوڑ میں بہت دور نکل گئے تھے لیکن مکانوں کی قسمت بڑی تکلیف وہ ہوتی ہے یہ ہجرت نہیں کر پاتے۔ مکین ایک ہجرت کرتا ہے لیکن مکانوں سے ہجرتیں کرنے والے ان گنت ہوتے ہیں۔

مکان کی عجیب خاصیت ہوتی ہے یہ اپنے کسی مکین کو کبھی نہیں بھولتا یہ ان کی یاد میں رفتہ رفتہ دم توڑنے لگتا ہے۔ اس کا رنگ روپ چمک دمک اور شان وشوکت ماضی کا قصہ بنتی چلی جاتی ہے۔

ایسے بہت سے مکانوں کی دیواروں کو چھو کر ہارون ان کے لمس کو محسوس کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اس کی ٹھوکر سے ایک شور ہوا۔

اس نے نیچے دیکھا وہاں کسی مکان کی ایک

تختی پڑی تھی۔
اس نے اسے اٹھایا اور اس کا مقام تلاش کرنے لگا وہ اسی دیوار سے گری تھی۔ دیوار میں نصب کرنے والی جگہ کا شگاف بتا رہا تھا کہ اسے وہاں سے الگ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔
اس نے تختی کو غور سے دیکھا۔
وہ زمانوں کی شکست و ریخت کی نشانی تھی۔
جگہ جگہ سے زخمی ہو کر ادھوری رہ گئی تھی۔
اس نے مالک کا نام پڑھنا چاہا لیکن وہ ادھورا نام تھا۔ وہ نام مٹ رہا تھا اپنے معنی اور مفہوم کو بیان کرنے سے قاصر تھا۔
اوپر ایک تاریخ لکھی تھی۔ 1940
اس نے نیچے لکھی تحریر کو دیکھا۔
"میرے بچوں کی یاد میں جو اس سال ایک قدرتی آفت میں لقمہ اجل بن گئے تھے یہ انہی کا آشیانہ ہے بس وہ یہاں کبھی آئے نہیں یہ گھر یہاں کی ہوا یہاں کی رونق اور یہاں کی ہر دعا انہی کے لیے ہے میرے دونوں بچوں کے لیے ہے۔"
قسمت کا کھیل بڑا عجیب ہوتا ہے اوپر باپ کا نام مٹ چکا تھا اور نیچے تحریر کے بعد بچوں کے نام مٹ گئے تھے۔
مگر تحریر زندہ تھی اس میں شہر کا نام باقی تھا۔
جدھر سے یہ مسافر آیا ہوگا۔
کئی سو کلومیٹر دور سے آتے اس مسافر نے وہاں کھوئے اپنے بچوں کی یاد میں یہ تعمیر کی تھی۔

ہارون نے تختی کو اٹھایا وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے وہ واپسی کے لیے مڑا اور چل پڑا۔
اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے وہ اسے لیجانا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ اس پتھر کی کہانی کو اپنے گھر محفوظ کر سکتا ہے وہ اسے یاد رکھ سکتا ہے۔
چلتے چلتے وہ گلی کی نکڑ پر آ گیا۔
اس نے پلٹ کر دیکھا اور مکان کو دور سے دیکھ کر رک گیا۔
مکان کی سیلانی دیواروں سے پانی رس رہا تھا ہریالی اور کائی اس پر جم چکی تھی اس پر بہار اور خزاں کے سارے موسم بیت گئے تھے۔
مکان کی دراڑیں اس کی شکستگی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھیں وہ اس تھکے ہارے مکان کو دیکھتا رہا۔
پھر وہ چلا گیا
وہ اگلے دن واپس پلٹا۔۔
اس نے اسی دیوار کے سینے میں اس پتھر کو گاڑ دیا۔
وہ اس کہانی کو لیجا رہا تھا مگر مکان کو اس کی آخری نشانی اور اس کا ساتھی لوٹانے واپس آ گیا تھا۔
وہ واپسی کی راہ میں سوچ رہا تھا کہ کہانی تختی سے قرطاس پر بکھر چکی ہے۔

☆☆☆☆☆

یہ زندگی ہے! (مائیکرو فکشن)

بہار کی آمد آمد ہے اور صبح سویرے درختوں میں پرندوں کی چہکار گونج رہی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں، کوئلیں کوک رہی ہیں اور ہریالی لہلہا رہی ہے۔ میں قدرت کا مرصع نغمہ اپنی سماعت میں انڈیل رہا ہوں کہ اچانک ایک فائر کی آواز گونجتی ہے اور ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا کچھ قدموں کی دوری پر گرتا ہے۔ جبکہ سیکڑوں پرندے چیختے چلاتے فضا میں بلند ہو جاتے ہیں۔ قدرت بولتی ہے، "یہ زندگی ہے!"

****

میرے سامنے 'قاف' کوہسار ہے، پیروں تلے شبنم آلود سبزہ زار اور اردگرد 'قاف' سے ہی منسوب 'مرغزار' ہے۔ میں یہاں وادیوں اور کوہساروں کی سیر کو آیا ہوں اور اب ہوا کے جھونکوں کی بانہوں میں مرغزار کے باسیوں کو رقص کناں دیکھ کر جھوم اٹھا رہا ہوں۔ جنگلی پھولوں کی مہک سے لبریز ہوائیں میرے تن من میں قدرت کی سخاوتوں کے نقوش اجاگر کر رہی ہیں اور قدرت مجھ سے مخاطب ہے۔ "یہ زندگی ہے!"

****

اچانک ہواؤں کی تیزی سرد تھپیڑوں کی مانند جسم پر سرسراتی ہے اور آسمان پر سیاہ بادل امنڈ آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی پناہ گاہ کا رخ کروں، موٹی موٹی بوندیں میرے تن سے ٹکرا کر اپنے وجود کا ثبوت دیتے ہوئے موسلا دھار بارش کا روپ لے لیتی ہیں۔ جمادات کا شور تھم گیا ہے۔ نباتات احتجاج کرتے ہوئے چیخ رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، کوک رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں اور سبزے کے فرش پر ٹھنڈا ٹھار پانی بہنے لگا ہے اور مجھے پھر سے قدرت کی پکار سنائی دیتی ہے، "یہ زندگی ہے!"

****

ہر چیز، ہر چہرہ، ہر وجود بارش کے بعد نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کسی نے زبردستی پکڑ کر سب کا منہ دھلا دیا ہے۔ میں چاروں اور گھوم گھوم کر خدا کی قدرت اور فطرت کی رعنائیاں دیکھ رہا ہوں۔ جانے کتنی دیر بعد اور نہ جانے کتنی دور آ کر مجھے گھر گھراہٹ سنائی دینے لگی ہے۔ کسی مشین کی چنگھاڑتی آواز، شاید کوئی ظالم مشین ہے جو کسی پر ظلم کر رہی ہے۔ گھرر گھرر گھرر۔۔۔ اور میں اس آواز کی سمت جا رہا ہوں۔ وہ سامنے چند لوگ ایک بڑی سے آری مشین سے ایک بڑے درخت کو کاٹ رہے ہیں۔ مشین کا زور درخت کے احتجاج کو شکست دے رہا ہے۔ آخرکار درخت ایک طرف کو جھکتا ہوا کڑکڑاہٹ کی آواز کے ساتھ سائیں سائیں کرتا زمین بوس ہوتا ہے۔ اسی وقت اچانک درخت کی گھنی شاخوں کی اوٹ سے بندر کی خوخیاٹ بلند ہوتی ہے اور دو بندر اچھل کر پتوں سے نکل کر دور بھاگ جاتے ہیں۔ قدرت پھر سے سرگوشی کرتی ہے۔ "یہی زندگی ہے!"

☆☆☆☆☆

حامد حسن

غزل

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

ناشناسا تھے، سو، چپ چاپ چلے آئے تھے
اس گلی میں فقط آوازۂ پا اپنا تھا

ایک چپ تھی کہ محیطِ لب و گویائی تھی
ہونٹ اپنے تھے نہ وہ رنگِ نوا اپنا تھا

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں جانِ وہ صبا اپنا تھا

ایک شوکت تھی کہ الفاظ بھی صولت کھو دیں
ایک نالہ تھا کہ پابندِ غنا اپنا تھا

ایک جھلمل تھی جسے حرف و سخن چھو نہ سکیں
لبِ قرطاس بھی محرومِ صدا اپنا تھا

ایک چھب تھی کہ نگاہوں میں گھلی جاتی تھی
غرقِ دریائے انا، ماوِ انا اپنا تھا

نرم رو دل سے بڑی نرم روی سے گزرا
چاپ چھن لی کہ وہ ہم دوشِ ہوا اپنا تھا

ایک پیرایۂ اظہار تھا وہ سروِ رواں
ہر قدم راہ بر و راہ نما اپنا تھا

سرِ آفاقِ مژہ، صبح کا تارا چمکا
اپنے آنگن میں تو جو گل بھی کھلا اپنا تھا

دور رہتے تھے کہ جی بھر کے اسے دیکھ ہی لیں
ربط کیا اس نے بھلا اس کے سوا اپنا تھا

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا، ورد اپنا تھا

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

خالد احمد

غزل

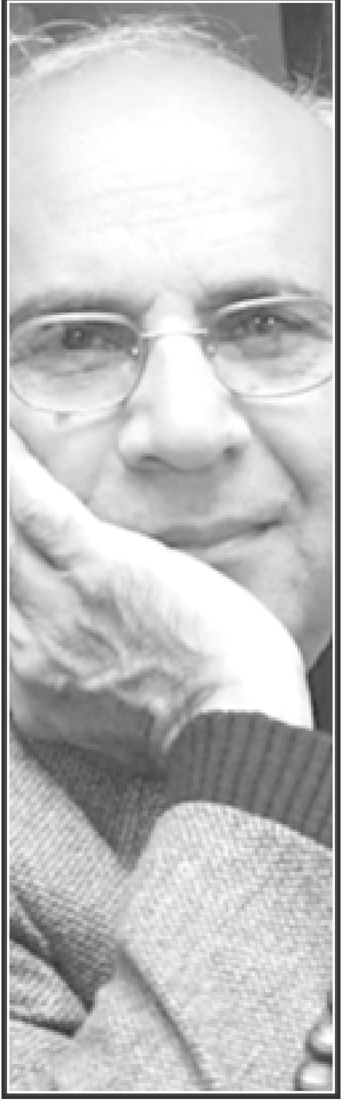

نہیں لکھتا، ڈرے لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے
پڑ گئے کیوں گلے، لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

میرے جن شعروں پہ دیتے ہیں وہ بے ساختہ داد
چاند تارے تلے لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

پاک دھرتی سے شکایت پہ وہ وہ وا بولیں
لفظ اک دو بھلے لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

رہوں غیبت کا جو سامع تو شماریں مرے وصف
"نفرتوں کے پلے"، لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

وہ جو انساں کے تصرّف پہ بہت بولتے ہیں
حشر کیسے ٹلے، لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

میری تخفیف میں منہ پھاڑتے کرگس کب کب
دشمنوں سے رَلے، لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

اُن کی بدگوئی پہ سوچا تھا کہ شاید عالیؔ
"اہلِ دل کو کُھلے" لکھ دوں تو انہیں چپ لگ جائے

جلیل عالی

غزلیں

یہ مَیں فلک سے جو فریاد کرتا رہتا ہُوں
اِسی بہانے اُسے یاد کرتا رہتا ہُوں

لگاتا جاتا ہُوں ہر ہر قدم پہ نخلِ اُمید
اُجاڑ بستیاں آباد کرتا رہتا ہُوں

بناتا رہتا ہُوں کاغذ پہ پھول سے چہرے
نئے نئے چمن ایجاد کرتا رہتا ہُوں

اُسی درخت کے سائے میں دب گیا ہُوں میں
جسے مَیں صورتِ شمشاد کرتا رہتا ہُوں

مِری صدا ہی مِرا احتجاج ہے خاورؔ
غلط کہ منتِ صیاد کرتا رہتا ہُوں

خاور اعجاز

کسی شمار میں ہُوں نے کسی قطار میں مَیں
پڑا ہُوا ہُوں اِک عرصہ سے رہگذار میں مَیں

اب ایک کُنجِ خزاں ہی مِرا مقدر ہے
کِھلا ہُوا تھا کبھی قریۂ بہار میں مَیں

کبھی کبھی جو یہ گردِ گذشتہ اُڑتی ہے
کہیں کہیں نظر آتا ہُوں اِس غبار میں مَیں

فلک پہ صدیوں سے مشغولِ کن فکاں ہے تُو
زمیں پہ صدیوں سے رحمت کے انتظار میں مَیں

اجل نے آ کے رہائی دلائی ہے خاورؔ
گھرا ہُوا تھا عجب زیست کے حصار میں مَیں

غزل

دل بُری طرح سے پامال ہے، وہ جانتا ہے
میرا کیا اُس کے بِنا حال ہے، وہ جانتا ہے

چاہے وہ اَور کسی نام کی نسبت سے سہی!
مجھ کو دھیان اُس کا بہرحال ہے، وہ جانتا ہے

اس کی موجودگی ہے میرے لیے کتنی اہم
سرد موسم میں مری شال ہے، وہ جانتا ہے

کوئی پرواہ نہیں میری وفاؤں کی اسے
گو وفاؤں کا بڑا کال ہے وہ جانتا ہے

وہ نہیں ہے تو زمانہ ہے مرے واسطے کیا!
کوئی زندانِ مہ و سال ہے، وہ جانتا ہے

اُس کی صورت ہی نظر آتی ہے ہر پہلو سے
دل مرا آئنہ تمثال ہے، وہ جانتا ہے

اس کی نسبت سے زمانے میں کشش ہے ورنہ
زندگی ورنہ تو جنجال ہے، وہ جانتا ہے

گردشِ وقت کی بندش کے ہیں قیدی ہم سب
کوئی آسیبِ مہ و سال ہے، وہ جانتا ہے

ایک اک قطرۂ اشک اُس کی جدائی میں نسیم
صورتِ آتشِ سیّال ہے، وہ جانتا ہے

نسیم سحر

غزل

جو بات دل کو لگے، کاش لب پہ آ جائے
شعورِ زیست میں رازِ ابد سما جائے

ستم ظریفیوں کی اس کی کوئی حد ہے کہ جو
ہمارے ہوتے ہوئے گھر ہمارا ڈھا جائے

عجیب کام یہ پکڑا ہے باڑ نے اکثر
بنامِ حفظ و اماں کھیت کو جو کھا جائے

وفورِ حبس کے مارے کھلی فضا چاہیں
بضد ادھر درِ زنداں کہیں رہا جائے

شدید کرب کا باعث ہے ایسی رسوائی
انائے ذات کو جو، سر کو بھی جھکا جائے

ہمیں تو کوئی میسر ہو ناخدا ایسا
سفینے کو لبِ ساحل ہی جو دکھا جائے

زمینِ دل خس و خاشاک سے اٹی ہے مگر
ضمیر شعلہ کی خواہش، اسے جلا جائے

یہ منصفی نہیں، یہ محض دیدہ ریزی ہے
جو دل میں آئے، اسے برملا کہا جائے

ریاضؔ کیسا وہ کیف آفریں نظارہ ہو
صدائے دل کو اگر غور سے سنا جائے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

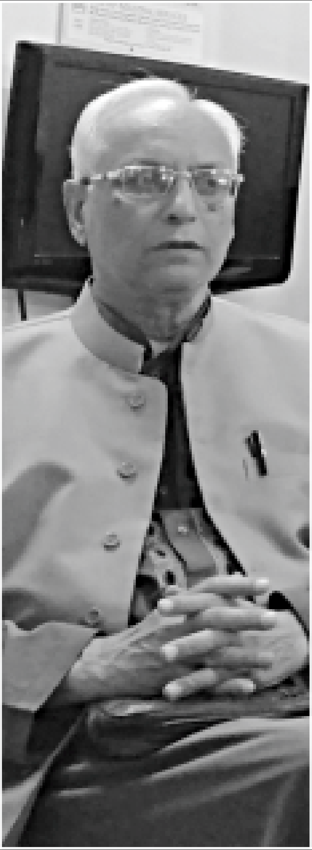

وہ نغمہ روح کو چھوتا گیا ہے
جو دل کے تار پہ چھیڑا گیا ہے

ابھی باقی بہت ہے سوچنے کو
ابھی سارا کہاں سوچا گیا ہے

تعجب ہے ہمیں بزمِ جہاں میں
بغیرِ مشورہ بھیجا گیا ہے

ہو جس کی جستجو میں تم پریشاں
ہمارے پاس سے بیٹھا، گیا ہے

حریمِ جاں کے دروازے پہ اے دوست
تمہارا نام ہی لکھا گیا ہے

کدورت دیکھ کے ثاقبؔ دلوں کی
رخِ خورشید بھی گہنا گیا ہے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خون میں گھل گئیں سانولی قربتیں
تن میں تپتی ہوئی ہڈیاں رہ گئیں

غزل

دائم نظر ہے تازہ جہاں پر لگی ہوئی
اک دھن ہے آدمی کو برابر لگی ہوئی

اوجھل رہے کہ خاک نشیں تھے نشیب میں
احباب کی نگاہ تھی اوپر لگی ہوئی

رہتا ہے دوسرا کوئی اندر مکان کے
تختی ہے اور نام کی باہر لگی ہوئی

جب تک نمو کا جوش رہا شاخ شاخ میں
جائے گی بیل پیڑ سے کیونکر لگی ہوئی

سوچا کہ صرف میں ہوں دکھوں میں گھرا ہوا
دیکھا تو آگ تھی وہی گھر گھر لگی ہوئی

تازہ گلاب کھلنے سے روکے نہ جائیں گے
ہے کس عبث خیال میں سر سر لگی ہوئی

گلزارؔ فیض دیکھیے رستے کے سنگ کا
بیدار کر گئی تجھے ٹھوکر لگی ہوئی

گلزار بخاری

غزل

روزِ ازل سے دنیا کا دستور لوٹ ہے
جغرافیہ غلط، مری تاریخ جھوٹ ہے

جس کو تو کائنات سمجھتا ہے اصل میں
کچھ ٹوٹنے سے پہلے کی اک ٹوٹ پھوٹ ہے

اک بار پھر سے سوچ لیں کچھ وقت ہے ابھی
ہم جس پہ جا رہے ہیں تباہی کا روٹ ہے

چاہے قفس میں ہوں کہ کسی کی پلیٹ میں
پیڑوں سے پنچھیوں کا تعلق اٹوٹ ہے

آزادی ہے قفس میں تڑپنے کی رات دن
آوازِ احتجاج اٹھانے کی چھوٹ ہے

باسی پھلوں پہ کون لگاتا ہے بولیاں
جب دستیاب منڈی میں تازہ فروٹ ہے

راحتؔ وہاں سے بچ کے نکلنے کی راہ دیکھ
پہچان آدمی کی جہاں سوٹ بوٹ ہے

راحت سرحدی

غزل

عہد و پیمان کو کھا جاتی ہے
موت امکان کو کھا جاتی ہے

مٹی کر دیتی ہے امیدوں کو
زندہ انسان کو کھا جاتی ہے

کچھ نہیں رہتا بچی کھاتے میں
نفع نقصان کو کھا جاتی ہے

بستی کی بستی بیاباں کرکے
پھر بیابان کو کھا جاتی ہے

چشمِ محبوب ٹھہر جائے اگر
دین و ایمان کو کھا جاتی ہے

دیکھتے دیکھتے بیماریٔ عشق
ساز و سامان کو کھا جاتی ہے

جب انا آئی پہ آ جاتی ہے
حکمِ یزدان کو کھا جاتی ہے

آہ اٹھتی ہے مرے سینے سے
اور طوفان کو کھا جاتی ہے

میری قسمت ہے وہ مسموم ہوا
جو گلستان کو کھا جاتی ہے

موت سے خواب نہیں مر سکتے
گو یہ ہر جان کو کھا جاتی ہے

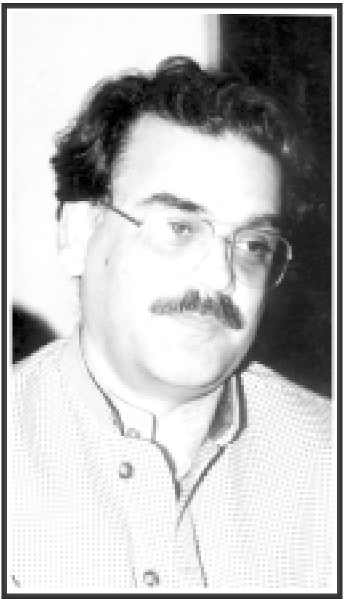

شاہنواز زیدی

غزل

سائے بڑھتے رہے
غم مچلتے رہے

بزم کو دیکھ کر
ہم ترستے رہے

راہ پُر خار ہے
بس گزرتے رہے

ہجر کے درمیاں
ضبط کرتے رہے

محشر بے اماں
ظلم سہتے رہے

راہ میں ہم سفر
رُخ بدلتے رہے

ایک آواز پہ
ہم تو چلتے رہے

بدگمانی سے ہم
دُور ہٹتے رہے

لوگ ساجد تھے
کیا سمجھتے رہے

سید افسر ساجد

غزل

دو چار قدم اور چلیں ساتھ کہاں ہو
کیا جانیے کل آ بھی نہ پاؤ کہ جہاں ہو

ہو سکتا ہے میں سوچتا ہوں جیسے ہو ویسے
ہو سکتا ہے یہ وہم ہو یہ میرا گماں ہو

ہو سکتا ہے یہ بھی ہو کوئی اس کی نئی چال
ہو سکتا ہے کل خود ہی وہ عبرت کا نشاں ہو

یہ دل مجھے کہتا ہے وہ سوچوں سا حسیں شخص
ممکن ہے ملو اس سے تو ویسا ہی جواں ہو

یہ کرنے کا وہ کہتا ہے تم ہاتھ ہو جس کا
یہ حکم اسی کا ہے کہ تم جس کی زباں ہو

ہو تیرا کرم جھوٹ کے پردوں کو کروں چاک
گر تیری عنایت ہو تو سچ مجھ سے بیاں ہو

مولا یہ ترے بندے ہیں بے یار و مددگار
ان کے لیے کوئی تو کہیں جائے اماں ہو

مولا جو ترے بندوں پہ کرتا ہے زمیں تنگ
وہ اپنا عدو بھی کبھی عبرت کا نشاں ہو

تو چاہے تو سب خاک ہو یہ جنگ کا ساماں
تو چاہے تو سب دھول ہو مٹی ہو دھواں ہو

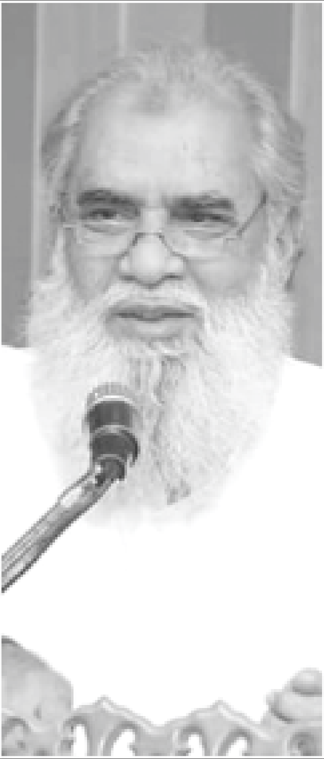

اکرم ناصر

غزل

روشنی کے قافلے مہتاب تک لے جائیں گے
رتجگے مجھ کو کسی دن خواب تک لے جائیں گے

دل کے سناٹے بدل جائیں گے اک دن شور میں
رفتہ رفتہ اشک بھی سیلاب تک لے جائیں گے

خوشبوؤں کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں شوق سے
قافلے اک دن گلِ شاداب تک لے جائیں گے

سب دکھائیں گے مجھے دار و رسن کا راستہ
عشق کے قصے درِ احباب تک لے جائیں گے

مت پریشاں ہو دلِ اقبالؔ راہِ عشق میں
ولولے تیرے تجھے اسباب تک لے جائیں گے

اقبال سروبہ

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزل

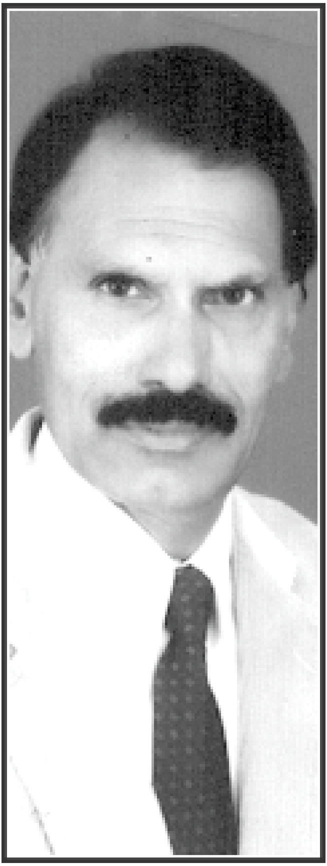

احمد جلیل

دل بہت مچلتا ہے بارشوں کے موسم میں
تجھ کو یاد کرتا ہے بارشوں کے موسم میں

گر یونہی رلانا ہے دل نے ڈوب جانا ہے
سیل کب اترتا ہے بارشوں کے موسم میں

جانے کیسا ساون ہے تر بہ تر بھی دامن ہے
پھر بھی من سلگتا ہے بارشوں کے موسم میں

خیر کچی بستی کی انتہا کی پستی کی
دل بہت دھڑکتا ہے بارشوں کے موسم میں

درد و غم کے ڈیرے ہیں ہر طرف اندھیرے ہیں
چاند کب نکلتا ہے بارشوں کے موسم میں

اب جلیلؔ جانا ہے اس کو ڈھونڈ لانا ہے
دل نہیں بہلتا ہے بارشوں کے موسم میں

---------- انتخاب ----------

- خالد احمد -

------ نعمان منظور ------

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

غزل

دن چڑھتے ہی احساس کی گرمی نے جھنجھوڑا
اخبار کی ہر چیختی سرخی نے جھنجھوڑا

ہم اپنے وطن لوٹ کے آئے تو ہمیں پھر
مرجھائی ہوئی کلیوں کی بستی نے جھنجھوڑا

شاید کہ کہیں اور نکل جاتے سفر میں
گھر آگیا ہے آپ کا، ساتھی نے جھنجھوڑا

میں جا بسا خوابوں کے جزیروں میں بڑی دور
سو بار اگرچہ مری مٹی نے جھنجھوڑا

مایوسیوں کی گود میں جب گرنے لگا تھا
مہکی ہوئی اک سوچ کی ٹہنی نے جھنجھوڑا

غربت میں رضاؔ راس نہ آیا کوئی موسم
گرمی نے جھنجھوڑا کبھی سردی نے جھنجھوڑا

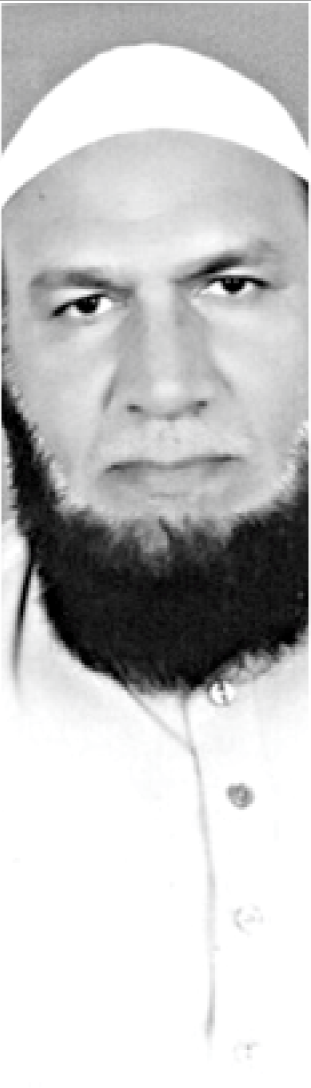

رضا اللہ حیدر

غزل

دن کی تدفین ہوئی شام کی نگرانی میں
شب ہے مصروف اندھیرے کی ثناخوانی میں

نبض رک جائے تو پھر سانس کہاں چلتی ہے
پھینک کر دیکھیے پتھر کو کھڑے پانی میں

جس کسی نے بھی پریشانی میں دیکھا اس کو
اس نے دیکھی ہے پریشانی، پریشانی میں

اس کو بھی ساس میں پھر ممتا نظر آتی ہے
عکس بیٹی کا اگر دیکھیں بہو رانی میں

خاک پر دھرتے ہیں سب بوریا بستر اپنا
ہم کو دلچسپی ہے کیا تختِ سلیمانی میں

کچھ پریشانی کو حیرانی میں ضم کرتے ہیں
کچھ ملا لیتے ہیں حیرانی پریشانی میں

زندگی تیری طرح ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں
بھوک نے دیکھ کے بھوکوں کو فراوانی میں

میری وحشت کے سوا کچھ بھی کہاں ہوتا ہے
رونق افروز مرے گھر کی بیابانی میں

کرۂ ارض پہ انسان بڑا خطرہ ہے
یہ پرندے ہیں درختوں کی نگہبانی میں

مجھ کو عادت ہی نہیں پشتوں سے آسانی کی
مجھ کو دشوار پڑے رہنا ہے آسانی میں

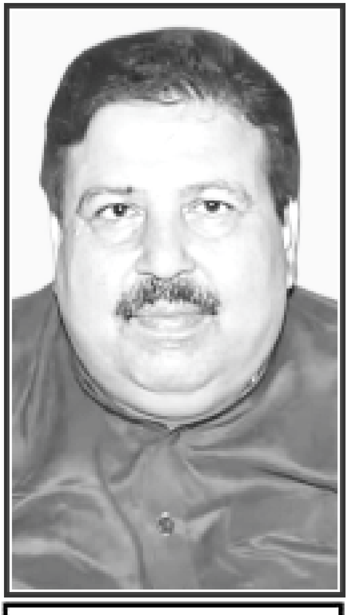

مسعود احمد

غزل

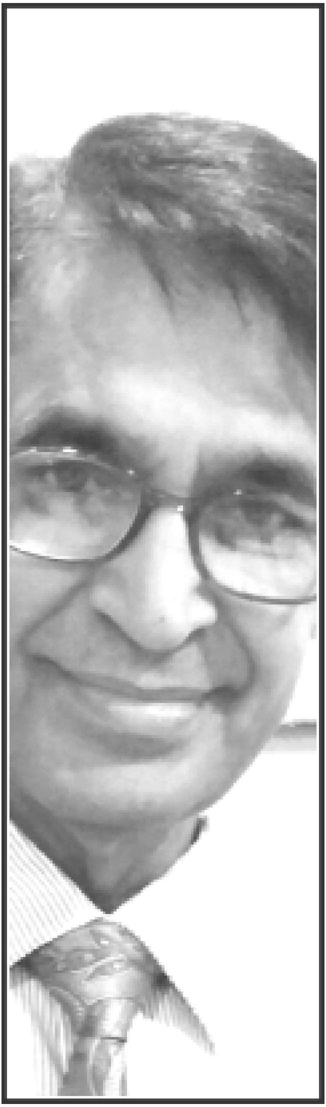

صفدر صدیق رضی

لازم کہیں نہیں رخِ قبلہ درست ہو
اتنا ہے صرف نیّتِ سجدہ درست ہو

مل بیٹھ کر جہاں نہیں رہتے گھروں کے لوگ
لگتا نہیں کہ شہر کا نقشہ درست ہو

باقی دنوں میں تجربہء عاشقی کے بعد
وہ کچھ کروں گا جس کا نتیجہ درست ہو

بیشک وہ لکھنؤ سینہ دہلی سے ہو مگر
شیریں زباں ہو، لب و لہجہ درست ہو

جو کچھ کسی کے سامنے کہنا محال ہے
ایسا نہیں کہ وہ پسِ پردہ درست ہو

بے راہ کو بھی راہ دکھاتی ہے گمرہی
ممکن نہیں کہ ہر کوئی رستہ درست ہو

بگڑے ہوئے سماج میں ہم بھی کریں تو کیا
کیسا درست ہو کوئی کتنا درست ہو

غزل

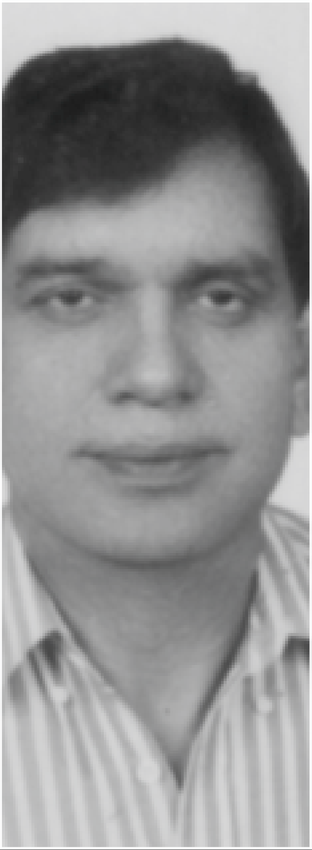

قیوم طاہر

تجھے ذرا سی یہ مہلت اٹھائے پھرتی ہے
انائے گردِ رعونت اٹھائے پھرتی ہے

گزر گیا وہ خوشی کے ایک شور کے ساتھ
یہ بوجھ، میری سماعت اٹھائے پھرتی ہے

یہ آفتاب ابھی دوپہر تک آیا نہیں
ابھی سے خلق، قیامت اٹھائے پھرتی ہے

کہاں کا کوئی منافع، کہ اپنی عمرِ تباہ
پرانا مالِ تجارت اٹھائے پھرتی ہے

یہ آتے جاتے ہوئے سانس ہی گنے ہم نے
یہ عمر، بارِ ندامت اٹھائے پھرتی ہے

ہزار چھید بھی جھولی میں ہوں، مگر طاہرؔ
زمین، طشتِ عنایت اٹھائے پھرتی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

غزلیں

ابوطالب انیم

اک نیا شعر اسی حرف میں بو جاتا ہے
کون ہر رات مری آنکھ پہ رو جاتا ہے

تجھ سے ملتا ہوں تو یک لخت مرا سارا وجود
کبھی اندیشے کبھی خوف میں کھو جاتا ہے

رات ہوتے ہی نکل آتا ہے آسیب حیات
دن نکلتے ہی مری قبر میں سو جاتا ہے

ذوق نظارہ بھی کیا ہے کہ تصور تیرا
میری آنکھوں سے ترا عکس بھی دھو جاتا ہے

دل پہ کیا بس ہے کسی کا جو رکھے جاں کا حساب
کب کیا جاتا ہے، نقصان تو ہو جاتا ہے

میں انیم اس لئے آنکھوں میں اٹک جاتا ہوں
کوئی ہے جو مرے اشکوں کو پرو جاتا ہے

کچھ اپنے طور طریقے سے میں بھی ریلا ہوں
پر اس ڈھلان پہ صاحب ترا دھکیلا ہوں

اٹھا کے چاک پہ رکھے مجھے، نیا ہر دن
سو روز شام کی چوکی پہ میں تو بیلا ہوں

میں اب تنور میں خواہش کے جل رہا ہوں روز
میں کیا کروں کہ میں دست ہوس کا بیلا ہوں

اب اس سے بڑھ کے اذیت کی بات کیا ہوگی
میں اس کے ہوتے ہوئے بھی بہت اکیلا ہوں

گو اس کی فکر بھی کم حوصلہ کا کام نہ تھا
مگر خیال بڑی مشکلوں سے جھیلا ہوں

میں اس سے جسم کی بازی کو ہار کیسے گیا
وہ جس کی روح سے میں بار بار کھیلا ہوں

وہی تو تھا مری ثروت کا اعتبار انیم
جو کہہ رہا ہے کہ میں حیثیت میں دھیلا ہوں

غزل

ہم اُن کے دل کو بھا گئے حیرت کی بات ہے
یہ دل لگی یہ مشغلے حیرت کی بات ہے

میں عازمِ سفر تھا کہ منزل نے آ لیا
وہ مجھ سے ملنے آ گئے حیرت کی بات ہے

توڑی ہے میں نے عشق میں توبہ ہزار بار
پھر میرے حق میں فیصلے حیرت کی بات ہے

ممکن نہ تھا پہاڑ سے پانی نچوڑنا
جاری جو چشمے ہو گئے حیرت کی بات ہے

پتھر گرا تھا جھیل میں پرکار تو نہ تھی
بنتے ہیں گول دائرے حیرت کی بات ہے

بویا تھا آنسوؤں کو ضرورت کے کھیت میں
اُگنے لگے ہیں قہقہے حیرت کی بات ہے

صحرا نوردیاں مری اِن پر نہ کھل سکیں
ہنستے ہیں مجھ پر آبلے حیرت کی بات ہے

اصحابِ کہف سو گئے برسوں گزر گئے
نکلے وہ زندہ غار سے حیرت کی بات ہے

اپنے بھی ارتحال کی جن کو خبر نہیں
لکھتے ہیں وہ بھی زائچے حیرت کی بات ہے

جانِ غزل ہے آج بھی وہ گُل بدن سحرؔ
مہکے ہوئے ہیں قافیے حیرت کی بات ہے

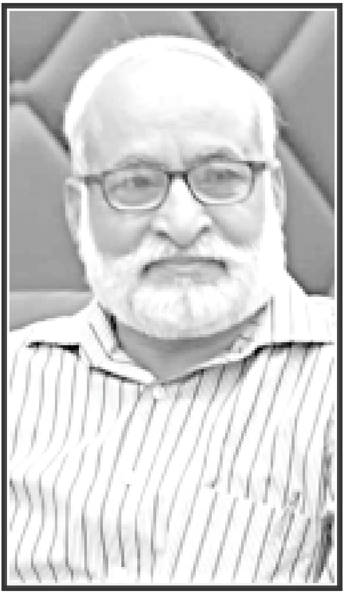

اکرم سحر فارانی

غزل

رکھتا ہے دل میں کس لیے یوں اک عناد تُو
بانٹے گا میرے ساتھ کوئی جائیداد تُو

ہے باعثِ وفور بھی، وجہِ فساد بھی
یوں شدتوں سے آتا ہے کیوں ہم کو یاد تُو

انساں غرض کا مارا ہوا ہے ازل سے دوست
کچھ سوچ کر جتانا ذرا اعتماد تُو

میں پھر سے کہہ رہی ہوں کہ تجھ کو قسم لگے
اک روز کاش سن سکے، خاموش ناد تُو

تجھ کو دکھائی دیتا نہیں آئینہ کبھی
میں جانِ جاں کہوں تو ہے میری مُراد تُو

میرے مشاہدے میں ہے انساں کی نفسیات
دیکھے گا رات، دن میں بس اپنا مفاد تُو

یہ کم ہے، میں نے خوب نبھایا حیات کو
جتنی بھی حوصلے کی بنے دینا داد تُو

مِلنے نہ آؤں تجھ سے کبھی رنجشوں کے بعد
ایسا کوئی بھی حکم نہ کر دینا صاد تُو

نازک سا عشق اتنا اہم کب سے ہو گیا
کن پہلوؤں پہ کرنے لگا اجتہاد تُو

رخشندہ تیرے ہاتھ میں ہیں کتنی اُنگلیاں
ہر ظلم کے خلاف کرے گی جہاد تُو

رخشندہ نوید

غزل

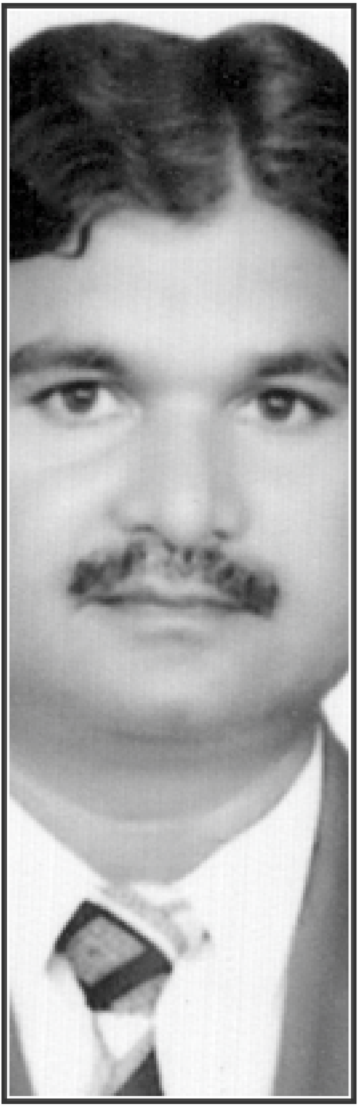

حیرت ہے کہ میں تیری نگرانی میں
ڈوب رہا ہوں اتنے گہرے پانی میں

مشکل جس کی عمر کا حصہ بن جائے
اس کو مشکل ہوتی ہے آسانی میں

عقلوں والے کب اتنے کر پائیں گے
میں نے جتنے کام کیے نادانی میں

اب تو خیر سے مُردوں والی صورت ہے
میں زندہ ہوں اک تصویر پرانی میں

مجھ کو شوق نہیں اس کی آرائش کا
خوش رہتا ہوں میں گھر کی ویرانی میں

پھر تو ایک زمانے تک حیران رہا
چھوڑ گیا تھا مجھ کو وہ حیرانی میں

انصرؔ تجھ کو بھی آوازیں دیتے ہیں
دیکھ وہ بجرے دریا کی طغیانی میں

انصر حسن

غزل

کچھ یاد تو نہیں ہے سرِ رہ کہاں ملے
اک باغ کھل رہا ہے وہاں پر جہاں ملے

اک ہفت رنگ قوس نظر آئی بوند میں
کچھ چاک پر بنائے ہوئے آسماں ملے

اک برف چل پڑی تھی سڑک کو تراش کر
اک جیپ کے نشان یہاں تھے، وہاں ملے؟

دہکنے لگا بدن پہ ذرا سا غبارِ لمس
تیرا گریز، میری طلب کب کہاں ملے

میں روشنی میں شیشے کا پیکر بنا رہا
کچھ سائے تھے جو مجھ سے بڑے سرگراں ملے

کس کا مدار، کس کا ستارہ، کہاں کی خاک
اک کہکشاں سے دوسری جب کہکشاں ملے

منظر اعجاز منظر

ملنے گیا تھا کل میں پرانے مکان سے
ملبہ ملا ، اُداسی ملی ، رفتگاں ملے

دنیا بڑے سکون سے آگے گزر گئی
ہم اہلِ اضطراب جہاں کے تہاں ملے

کم ہوتے ہوتے گلی بند ہو گئی
ہونٹوں سے ہونٹ اور مکاں سے مکاں ملے

خانہ بدوش رُک گئے سامان رکھ دیا
آنکھیں جہاں حسین ملیں، لب جہاں ملے

ہم نے بھی احتیاط سے دامن چھڑا لیا
کانٹے بھی مسکرا کے خوئے دوستاں ملے

غزل

درد سے درد کا احساس فزوں ہوتا ہے
اشک آنکھوں سے ٹپکتا ہے تو خوں ہوتا ہے

چاند کی سمت لپکتے ہیں جو عشاق کے دل
یہ بھی اک طرح کا انداز جنوں ہوتا ہے

یہ جو آنکھوں میں اداسی کی نمی رہتی ہے
اپنے اندر کی اذیت کا فسوں ہوتا ہے

میں کوئی اور یقیں اور گماں رکھتا ہوں
آپ کہتے ہیں کہ یوں ہوتا ہے ووں ہوتا ہے

وہ جو مرتا ہے کسی اپنے کی بانہوں میں علیؔ
اس کے چہرے پہ محبت کا سکوں ہوتا ہے

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پولے پولے پاؤں دھرے پروائی بھی
خاک میں اڑتے رنگ یہ کس کے سنگ بھرے

غزل

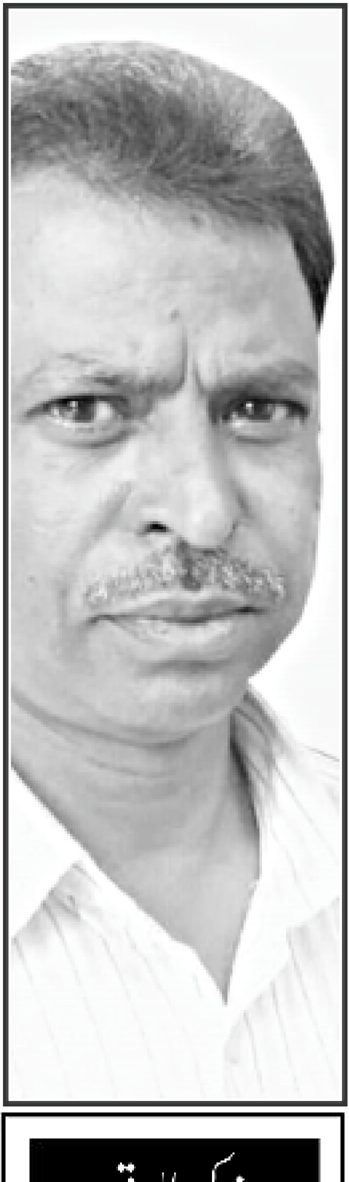

وہ تیز ہوا پانی کا طوفان الگ ہے
اور پیار کا دل میں بپا ہیجان الگ ہے

بن تیرے مصیبت میں مری جان الگ ہے
جو دل کا جہاں ہوگیا سنسان الگ ہے

حوروں کی بھی میں عظمتیں تسلیم ہوں کرتا
لیکن اے مرے یار تری شان الگ ہے

اس میں نہ سکوں ہے نہ تو نیندیں ہیں نہ ہی خواب
تم سب سے مرا یار و شبستان الگ ہے

میں اس کے سوا اور کسی کو بھی نہ جانوں
یعنی کہ مرا عشق میں رجحان الگ ہے

بس اپنی انا کے لیے وہ مجھ سے بچھڑ کر
تنہا تو ہوا ہی ہے پریشان الگ ہے

یہ باعثِ عبرت ہے کہ اس دنیا میں سب سے
جو عشق و ادب والا ہے انسان الگ ہے

ذکی طارق

غزل

ہے اگر دل آستانہ یار کا
لامکاں بھی ہے ٹھکانا یار کا

وحدہٗ کے نقشِ وحدت پر ہے دال
مختلف چہروں میں آنا یار کا

پوچھ لو ہر سانس کے سُرتال سے
دھڑکنیں بھی ہیں ترانہ یار کا

غم سے کیا نفرت، خوشی کی کیا ہوس
اِک تعلق ہے دوگانہ یار کا

بانگ ہے توحید کی گویا اذاں
ہے تصور پنجگانہ یار کا

آج کی یہ موت کل کا حشر ہے
وصل کو ہے کیا بہانہ یار کا

مسندِ شاہی کہ اوجِ دار ہو
اصل میں ہے جلوہ خانہ یار کا

اپنی ہستی سر بسر کھوئے بغیر
غیر ممکن، بھید پانا یار کا

زد میں ہے فیضانؔ ہر پست و بلند
چوکتا کب ہے نشانہ یار کا

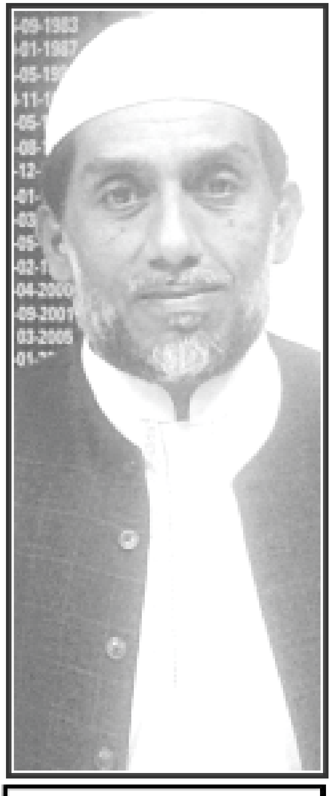

فیض رسول فیضان

غزل

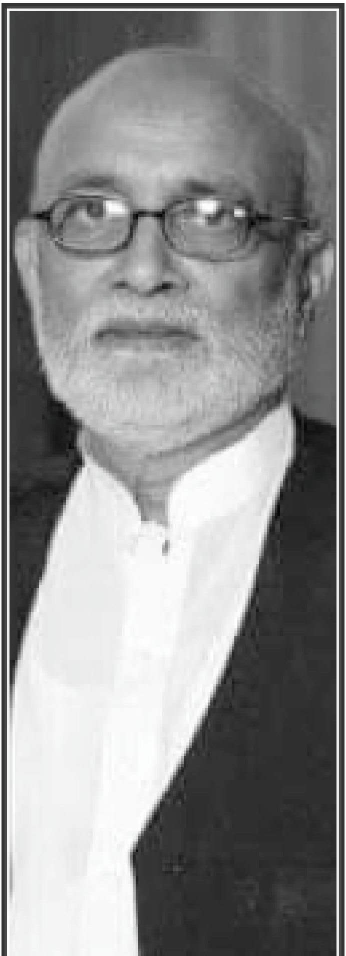

جب ہے سب آب و تاب مٹی سے
کیوں کروں اجتناب مٹی سے

میں ہوں مٹی سے، کیسے ممکن ہے
میں نہ ہوں کام یاب مٹی سے

وقت وہ آ رہا ہے جب ہو گا
ہر سوال و جواب مٹی سے

میں نے پائے ہیں اپنی دنیا کے
سارے تعبیر و خواب مٹی سے

زندگی کی کتاب کے سارے
میں نے لکھے ہیں باب مٹی سے

ہم تو اس کے رہینِ منت ہیں
پایا ہے بے حساب مٹی سے

پھول بوئے ہیں ہم نے ہاتھوں سے
کیوں نہ پائیں گلاب مٹی سے

خوب لاحق نہیں کوئی انجم
جب نہیں ہے حجاب مٹی سے

محمد افضال انجم

غزل

لگے رقیب سے ضربت بھی اور گزند نہ ہو
کوئی زمانے میں اتنا بھی ضبط مند نہ ہو

سبھی عزائے محبت کا پاس رکھتے رہیں
فراق و ہجر کا گریہ کبھی بھی بند نہ ہو

مجھے بھی توڑ کے لانا ہے ایک نجمِ وفا
دعا کرو وہ کہیں عازمِ کمند نہ ہو

مزاج نرم ہے تیرا گلوں کی بزم میں رہ
تو ساکنانِ عقوبت میں خار قند نہ ہو

وجودِ خاک تو صحرا خمیر ہوتا نہیں
میں پیر کاٹ لوں گر آبلہ پسند نہ ہو

ساگر حضور پوری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات لبوں پر کیا کیا برسا ابر تری مہمانی کا
پیاس کا جھولا جھول رہا تھا ایک کٹورا پانی کا

غزل

دیوار کے ہوئے تو کبھی در کے ہو گئے
میرے چراغ بادِ ستمگر کے ہو گئے

اُس کے دل و نگاہ کا کس سے کریں گلہ
اُس کے دل و نگاہ تو پتھر کے ہو گئے

جو مجھ کو چاہتے تھے کبھی سر سے پاؤں تک
دشمن نہ جانے کیوں وہ مرے سر کے ہو گئے

جو تیرے پیرہن کی مہک لے کے آئی تھی
ہم تو اُسی ہوائے معطر کے ہو گئے

جب تیری خوشبوؤں کی طلبگار میں ہوئی
تیرے چمن کے پھول بھی پتھر کے ہو گئے

یہ کیسی گردشیں ہیں کہ ارض و سماء پہ آج
شمس و قمر چراغ برابر کے ہو گئے

خیمے جلے چراغ بجھے اور اس کے بعد
نیزوں پہ سر بلند، بہتّر کے ہو گئے

بارش کو بادلوں کو سمندر کو چھوڑ کر
افروز ہم تو ساقیٔ کوثر کے ہو گئے

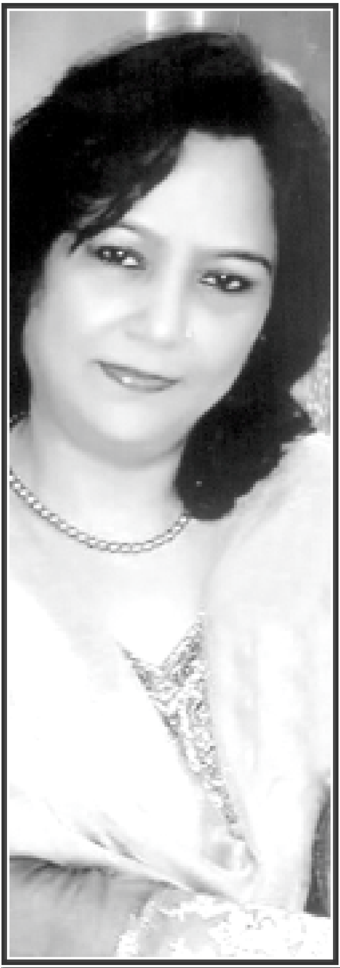

افروز رضوی

غزلیں

دل کے کعبے میں ترا بت تھا اسے پھوڑ دیا
عشق تھا کارِ جنوں، ہم نے جنوں چھوڑ دیا

اس سے آگے کبھی پڑھنے کی تمنا نہیں کی
جس جگہ تُو نے فسانے کا ورق موڑ دیا

جس پہ تھا مان کبھی خود سے زیادہ ہم کو
کیا قیامت ہے اسی شخص نے دل توڑ دیا

کیا ہو تعریف تری کوزہ گری کی جس نے
غمزۂ چشم سے ٹوٹا ہوا دل جوڑ دیا

اول اول تو کہانی کے مناظر تھے کمال
آخرش دستِ قلم کار نے رخ موڑ دیا

مثالِ کعبہ ترا عمر بھر طواف کیا
یوں ہم نے تجھ سے فزوں عین شین قاف کیا

مدارِ عشق سے نکلیں یہ جستجو ہی نہ کی
نہ راہ بدلی، نہ مرکز سے انحراف کیا

کوئی دلاسہ ملا ہے، نہ اذنِ گریۂ شب
عبث جنوں میں شب و روز اعتکاف کیا

رہی نہ دل میں تمنائے مہر و الفت جب
ستم ظریف نے تب جا کے اعتراف کیا

وفا کی راہ میں منزل کبھی نہیں ملتی
بڑی ہی دیر سے دنیا نے انکشاف کیا

شگفتہ نعیم ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جبیں کھنگال لیتا تو آنکھیں کھنگالنا
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

غزل

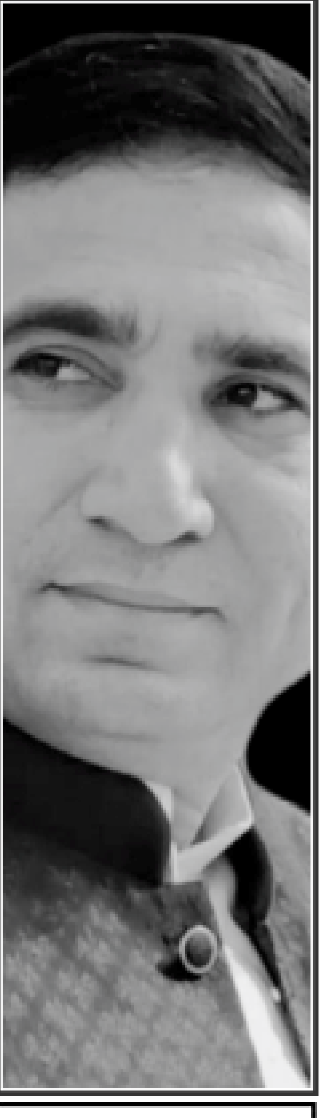

اکمل حنیف

چل رہا ہوں میں ہجومِ شہر سے ہو کر الگ
اس لیے مجھ کو نظر آنے لگے منظر الگ

ایک بوڑھا شخص اپنے گھر میں ہی بے گھر ہوا
اس کے بیٹوں نے کیے ہیں اپنے اپنے گھر الگ

خوف پہلے بھی بہت تھا چھوڑ جانے کا ترے
آج باتوں سے تری، جاگا ہے دل میں ڈر الگ

عشق تیری لاج رکھیں گے ترے دیوانے یوں
ایک دوجے سے ہوئے تو ہوں گے بس مر کر الگ

زندگی بھی اک اذیت کی طرح دے کر ہمیں
اور پھر اُس نے مسلط کر دیا محشر الگ

دشمنوں سے جیت کا اعلان کرنے والا تھا
چھوڑ کر سالار کو جب ہو گیا لشکر الگ

میں نے اکملؔ آنچ آنے دی نہ اپنے خون پر
تب گری دستار میری، جب ہوا تھا سر الگ

غزل

چشمِ ادراک میں ملیں گے نہیں
ہم اگر خاک میں ملیں گے نہیں

ہم کہانی میں مرکزی ہیں بجا
کہیں اوراق میں ملیں گے نہیں

چشمِ تر کے مکین ہیں ہم تو
دل سے سفاک میں ملیں گے نہیں

پائے جائیں گے سوئے دشت کہیں
کنجِ افلاک میں ملیں گے نہیں

سر بسر کن کا معجزہ ہیں سو ہم
قصہء چاک میں ملیں گے نہیں

ہم برہنہ حیات ہیں افسرؔ
تم کو پوشاک میں ملیں گے نہیں

افسر منیر

غزل

بتاؤں ! کتنا ترا ، کتنا اپنا رہ گیا ہوں
بُریدہ شاخ پہ مَیں ایک پتا رہ گیا ہوں

نہ دوڑ ختم ہوئی اور نہ ہی ملے وہ لوگ
میں بھاگتے ہوئے سب سے اکیلا رہ گیا ہوں

ڈرے ہوئے ہیں وہ نرغے میں گھیرنے والے
کھڑا ہوں ڈٹ کے اگرچہ نہتا رہ گیا ہوں

ہوائے تازہ کی اُمید ہے ابھی ورنہ
میں ایک سوکھے ہوئے پیڑ جیسا رہ گیا ہوں

میں جن کے درمیاں تھا، اُن سے دُور ہوتا گیا
میں جس سے دُور تھا، اب صرف اُسی کا رہ گیا ہوں

اگرچہ جیسی ہے، اپنی تو ہے مری آواز
ظہورؔ تنہا ہوں لیکن مَیں اچھا رہ گیا ہوں

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے کسوں کی طرح ہم بھی ہاتھ مل کر رہ گئے
کیا کہیں خالد ، پسِ دیوار زنداں کیا ہوا

غزل

ٹوٹے جو شاخسار سے وہ کب ہرے ہوئے
زندوں میں کب شمار ہوئے ہیں مرے ہوئے

راغب دکھائی دینے لگے اور بھی حسین
مشہور اپنے عشق کے جب تذکرے ہوئے

بھر کر بھی خالی رہی تھی زنبیل عمر بھر
چھونے سے آپ کے مرے کھوٹے کھرے ہوئے

یہ خوف منزلوں پہ ہمیں لے کے جائے گا
منظر ڈرے ہوئے ہیں مسافر ڈرے ہوئے

مانا بجھا تو دیں گے سمندر کی تشنگی
لیکن جو خالی ہو گئے دریا بھرے ہوئے!

ثابت نہیں کریں گے کبھی خود کو بے گناہ
بے وجہ جرمِ عشق میں ہیں جو دھرے ہوئے

بے اختیار ہنسنے لگے جاذبؔ اہلِ درد
سنجیدہ کچھ زیادہ ہی جب مسخرے ہوئے

اکرم جاذب

غزل

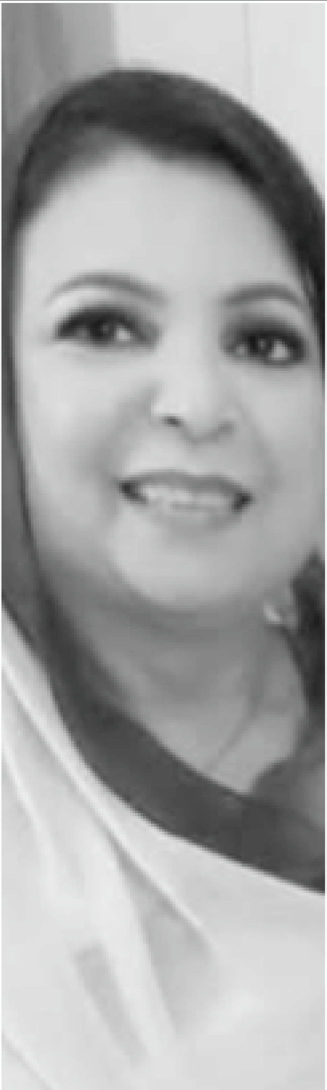

گم ہیں اپنے ہی خیالات کے بیچ
نہیں موجود ملاقات کے بیچ

فرق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
تیرے اور میرے خیالات کے بیچ

دورِ بے حس میں ہوں زندہ ایسے
زندگی جیسے جمادات کے بیچ

چارسو تُو ہے ، تری یادیں ہیں
شہرِ دل یوں ہے مضافات کے بیچ

چاہیے حرفِ شکایت کے لیے
اک توقف بھی مناجات کے بیچ

تیرا احساس نمایاں دیکھوں
سانس سے لے کے عبادات کے بیچ

دیکھ کر چلنا کہیں ہو نہ فریب
پیار کے پیچھے ، مدارات کے بیچ

میرے مرنے کا سبب مت پوچھو
دب گئی تھی میں عنایات کے بیچ

خالدہ انور

غزل

کس طرح دُکھ کو جھیلتے ہیں لوگ
جان پر اپنی کھیلتے ہیں لوگ

دل کے آنگن میں آپ جیسے کچھ
سائے کی طرح پھیلتے ہیں لوگ

روٹیاں خواہشوں کی حسرت سے
دل کے چکلے پہ بیلتے ہیں لوگ

قہوہ خانے سے دل کے کپ میں کچھ
چائے اپنی اُنڈیلتے ہیں لوگ

دل کو بھی اِک کھلونا جانتے ہیں
اس لیے اس سے کھیلتے ہیں لوگ

یار کی بزم میں یہ عالم ہے
ناتواں کو دھکیلتے ہیں لوگ

غم کے چرکے لگائے دل پہ ہزار
کس طرح ہنستے کھیلتے ہیں لوگ

سرفراز عارض

غزل

چل پڑا ہوں تو میں تا حدِ گماں جاؤں گا
جس طرف کوئی نہیں جاتا وہاں جاؤں گا

چاند تارے ہی تو لانے ہیں فلک سے جا کر
جاؤں گا، جاؤں گا، اے جانِ جہاں جاؤں گا

سوچتا ہوں کہ یہاں سے کہیں ہجرت کر جاؤں
اور پھر یہ بھی کہ جاؤں تو کہاں جاؤں گا ؟

دفن کر کے مرے احباب جو رخصت ہو جائیں
پھر میں آرام سے سوچوں گا، کہاں جاؤں گا

میرے ہم زاد کی صورت میں مرے ساتھ ہے وہ
ساتھ ہو گی مری رسوائی جہاں جاؤں گا

ایک مدت سے لیے پھرتا ہوں اس جسم کو ساتھ
اب کے میں چھوڑ کے یہ بارِ گراں جاؤں گا

اس کو اچھی نہیں لگتیں مری ساری باتیں
سو کہیں چھوڑ کے اب اپنی زباں جاؤں گا

فکر مت کیجیے، غربت کے سہارے ہیں اور
آپ کیا سمجھے تھے میں آپ کے ہاں جاؤں گا

کوئی تو آئے گا یہ مفت کا سودا لینے
میں کھلی چھوڑ کے جب دل کی دکاں جاؤں گا

کون لکھے گا مرا نام ستم گاروں میں
لے کے سینے پہ جو ماتم کے نشاں جاؤں گا

یہ جو بپھرا ہوا دریا ہے اتر جائے ذرا
ڈھونڈنے پھر میں وہاں اپنا نشاں جاؤں گا

میں بھی انسان ہوں، ماضی سے محبت ہے مجھے
جونہی موقع ملا میں کوئے بتاں جاؤں گا

مے کدہ ہے وہ میاں اور شرابی ہوں میں
روز جاؤں گا وہاں، روز وہاں جاؤں گا

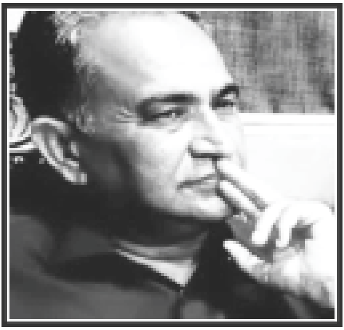

علمدار حسین

غزل

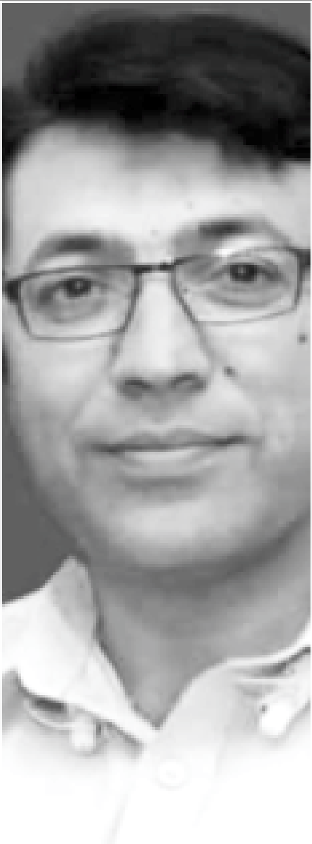

پوچھتی رہتی ہے اکثر مری تنہائی بھی
کیا یہ ممکن ہے کہ لوٹ آئے وہ ہرجائی بھی

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوٹ کے آجائے کبھی
یا یہ ممکن ہے کہ مٹ جائے تمنائی بھی

اب تو موسم میں کوئی رنگ نظر آتا نہیں
لے گیا وقت کی آنکھوں سے وہ بینائی بھی

درد اتنا ہے کہ اب حرف بھی رو پڑتے ہیں
چھین لی ہجر نے لفظوں کی شکیبائی بھی

راہ تکتے رہے ہر روز در و بام تری
اور دہلیز پہ بیٹھی رہی رسوائی بھی

مر ہی جاتا ترے بن کنجِ قفس میں عابد
شکر ہے ساتھ مرے رہتی ہے تنہائی بھی

عابد خان عابد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزل

غبارِ دشت میں رستہ دکھائی دینے لگا
بھٹک گیا تو ستارہ دکھائی دینے لگا

بہت قریب سے دریا نظر نہیں آیا
بہت ہی دور سے چشمہ دکھائی دینے لگا

اسے میں اتنی بلندی سے جاتے دیکھتا ہوں
افق کے پار بھی جلوہ دکھائی دینے لگا

بتا رہا تھا وہ دریا کے بارے اور اس میں
مجھے بھنور کا اشارہ دکھائی دینے لگا

ڈرا رہے تھے سبھی لوگ جب بلندی سے
مجھے پہاڑ پہ زینہ دکھائی دینے لگا

سمجھ رہا تھا جسے میں ہمالیہ جیسا
قریب آیا تو ٹیلہ دکھائی دینے لگا

درود پڑھتے ہوئے مانگی جب دعا شاہدؔ
ہتھیلیوں میں مدینہ دکھائی دینے لگا

شاہد اشرف

غزل

بدن کو راکھ کیا، آنکھ کو ستارہ کیا
تری خوشی کے لیے غم کو استعارہ کیا

میں اپنے آپ میں گم ہو کے رہ گیا آخر
بُرا کیا جو تری ذات سے کنارہ کیا

یہ کیسی دوریاں در آئیں درمیاں اپنے
نہ دل سے تو نے، نہ میں نے تجھے گوارا کیا

اُدھورا چھوڑ دیا تھا جو کام غفلت میں
ہوائے عالمِ حیرت میں وہ دوبارہ کیا

جو بھید کُھل نہ سکا تھا ہزار کوشش سے
وہ بے خیالی کے لمحوں نے آشکارہ کیا

قریب ہوتے ہوئے دور جو رہے ہم سے
کچھ ایسے لوگوں میں ہم نے رضا گزارا کیا

علی رضا

غزل

ویسے تو اِرد گرد بھی کم ٹھیک ٹھاک ہیں
لیکن خُدا کا شکر کہ ہم ٹھیک ٹھاک ہیں

آنکھیں تو خیر آنکھیں ہیں رونا ہے اِن کا کام
سانسیں بھی روز کھینچتی غم ، ٹھیک ٹھاک ہیں

یہ بات مختلف ہے کہ چرچا نہیں کیا
جھیلے تو ہم نے رنج و الم ٹھیک ٹھاک ہیں

دُنیا تو خیر دُنیا ہے اِس کا گِلہ فضول
ڈھائے تو آپ نے بھی ستم ٹھیک ٹھاک ہیں

دُنیا و دِیں میں میرے توازن کی داد دے
دِل میں خُدا کے ساتھ صنم ٹھیک ٹھاک ہیں

کم بخت سیم و زر سے ہماری نہیں بنی
لیکن ہماری جیب میں غم ٹھیک ٹھاک ہیں

جب سے کہے ہیں لفظ کی حُرمت پہ چار شعر
ناراض ہم سے اہلِ قلم ٹھیک ٹھاک ہیں

ورنہ یہ شہر کب کا ہمیں نوچ ڈالتا
دانش خُدا کے ہم پہ کرم ٹھیک ٹھاک ہیں

دانش عزیز

غزل

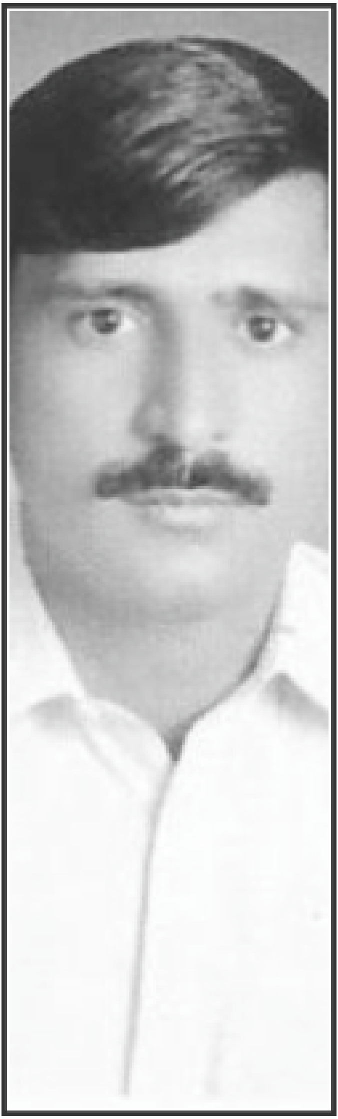

یہ عاشقی بھی عجیب و غریب ہوتی ہے
نگاہِ عشق میں ہر شے رقیب ہوتی ہے

غمِ جہاں سے سروکار ہی نہیں ہوتا
تمہاری یاد جو دل کے قریب ہوتی ہے

وہ آئے اور کبھی لوٹ کر نہیں جائے
بس ایک آخری خواہش حبیب ہوتی ہے

گزرنا پڑتا ہے رنج والم سے پہلے پہل
پھر اس کے بعد ہی راحت نصیب ہوتی ہے

خیال وخواب سے ہم اس لیے نکلتے نہیں
یہ نیند بھی تو ہماری طبیب ہوتی ہے

ہنروری بھی عنایت ہے میرے مولا کی
کسی کسی کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے

جو اس کو سنتا ہے دانش دھمال ڈالتا ہے
محبتوں کی کہانی عجیب ہوتی ہے

اعجاز دانش

غزل

زندگی درد سے عبارت تھی
خواب دیکھیں کسے یہ فرصت تھی

کاش تم نے بھلا دیا ہوتا
یاد رکھنے میں کر اذیت تھی

تم نے کیا کرنا تھا مجھے تنہا
مجھ کو تنہائیوں سے نسبت تھی

شام کا ملگجا اندھیرا تھا
جانے کیوں شب میں اتنی وحشت تھی

سامنے تھا مرے مگر چپ تھا
اس کے دل میں بھی کچھ کدورت تھی

بانٹنے درد کون آتا پھر
وقت ملتا تھا اور نہ فرصت تھی

ہنستے ہنستے وہ رو پڑا تھا کیوں
کیا اسے بھی کبھی محبت تھی

نائلہ راٹھور

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

روپ کو دھن جانا تو من میں لوبھ گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا، صحرا صحرا، دامن میرا پھیل گیا

غزل

غلام گردشِ ایام کا نہیں ہوتا
جنوں کا شوق در و بام کا نہیں ہوتا

کبھی کبھی اُسے صدیاں بھی طے نہیں کرتیں
جو دیکھنے میں سفر گام کا نہیں ہوتا

مجھے تو اپنی ضرورت نہیں پڑی اب تک
وگرنہ میں بھی کسی کام کا نہیں ہوتا

وہ آئنہ کہ جو یادِ خدا سے ہے آباد
وہ ٹوٹ کر بھی کبھی دام کا نہیں ہوتا

خمارِ عشق چڑھا ہے شعور پر جس کے
کبھی وہ صبح ، کبھی شام کا نہیں ہوتا

جو ڈوب جاتا ہے ساقی تری نگاہوں میں
وہ شخص اور کسی جام کا نہیں ہوتا

یہ دل بھی کیا ہے کہ اُس پر ہی مرمٹا صابر
کہ جس کا خط بھی مرے نام کا نہیں ہوتا

صابر رضا

غزل

صغیر احمد صغیر

ہم وہاں پر کبھی یہاں بھولے
اتنا بھولے کہ الاماں بھولے

زندگی کے سوال تھے مشکل
کیا بتائیں کہاں کہاں بھولے

کیا ہمیں واقعی سزا دو گے
ہم یہ کہہ دیں اگر کہ ہاں بھولے

بے گھری کی تو کچھ رعایت ہو
لامکانی میں لامکاں بھولے

لوگ بھولے کہیں کہیں سے مگر
ہم مکمل ہی داستاں بھولے

کیا اسے بھی کوئی بھلاتا ہے
جس کی خاطر کوئی جہاں بھولے

بھول کر بھی گیا نہیں دل سے؟
جو بھلایا وہ رائگاں بھولے

غزل

راستہ تھا کہیں پہ جاتا ہُوا
اک پرانا چراغ گاتا ہُوا

زرد پتوں کے درمیان کہیں
پیار کا عکس جھلملاتا ہُوا

خامشی کے مہیب جنگل میں
اک پرندہ تھا چہچہاتا ہُوا

یار بھی ہیں یہیں کہیں میرے
تیر آیا ہے سنسناتا ہُوا

ایک کھڑکی کھلی حویلی کی
ہے کوئی دور سے بلاتا ہُوا

کرچیاں پتلیوں میں چبھتی ہوئیں
خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتا ہُوا

باغ مہکا ہوا ہے خوشبو سے
پھول بالوں میں مسکراتا ہُوا

اُس کی آواز آ رہی ہے مجھے
ایک پردہ ہے سرسراتا ہُوا

اک ستارا زمیں پہ جبرانؔ
ہے مری دسترس میں آتا ہُوا

وسیم جبران

غزل

اب کسی اور کے در پر نہیں جانا چاہے
دل یہاں رہنے کا کچھ اور بہانہ چاہے

اس نے اس دل سے نہ جانے کی قسم کھائی ہے
اور آئے بھی کوئی کیسے جو آنا چاہے؟

میری بربادی میں اک حصہ مری سوچ کا ہے
میں اسے چاہوں جسے سارا زمانہ چاہے!

کیا بچے گا؟ میں اسے لاکھ بچانا چاہوں
وہ حسیں تیرِ نظر دل کا نشانہ چاہے

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

غزل

مستحسن جامی

ہر سُو اداسیوں کا سبب جانتا ہوں میں
یہ انتظارِ ظلمتِ شب جانتا ہوں میں

دنیائے ہست و بود کے رستوں کا علم ہے
ہر ایک بزمِ رقص و طرب جانتا ہوں میں

روزِ ازل سے رُوح کے اسباق حفظ ہیں
لوگوں میں بول چال کا ڈھب جانتا ہوں میں

خاموش ہوں تو کوئی سبب بھی ضرور ہے
ورنہ تو کائنات میں سب جانتا ہوں میں

جو جا چکے ہیں اُن کے مسائل نہ پوچھیے
جو آ رہے ہیں اُن کی طلب جانتا ہوں میں

یہ میرے ساتھ ہی تو جوانی کو پہنچے ہیں
عشاقِ ہجر سب کا نسب جانتا ہوں میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سمت بس اک رت ہو، ہر سمت یہ چرچا ہو
آنکھیں کہیں امڈی ہوں، بادل کہیں برسا ہو

غزل

بجے پھر تار کیا دل کے
میں صدقے جاؤں اس تل کے

کیوں اٹھ کر خود نہیں آتے
ذرا راضی نہیں ہل کے

مرا سب کچھ تمھارا ہے
سوائے جانِ جاں ، دل کے

نہیں ہوتی حیاتی وہ
کٹے جو دن مسائل کے

وہ خنجر مل گیا آخر
نشاں جس پر تھے قاتل کے

سبھی ہیں جیب سے خالی
کہ پیسے کون دے بل کے

وہ ڈالے ہاتھ ہاتھوں میں
کھڑے تھے پاس ساحل کے

ہے جیون مختصر قیصرؔ
گزاریں ساتھ گھل مل کے

نبیل قیصر

غزل

نوید عاجز

یہ بات سچ ہے کہ سب کو خدا سے ملتا ہے
مگر وہ کہتا ہے: سعیِ صفا سے ملتا ہے

زمانے بھر کی کتابوں سے بھی نہیں ملتا
وہ اک سبق جو کسی آشنا سے ملتا ہے

کہاں سنا ہے کہاں، ٹھہرو! مجھ کو یاد آیا
تمھارا لہجہ تو اس بے وفا سے ملتا ہے

بلاؤ لوگ کٹہرے میں وہ جو کہتے تھے
جتن سے ملتا ہے یا تو دعا سے ملتا ہے

مجھے خبر ہے مرے گھر نہیں رکیں گے آپ
مزاج آپ کا بادِ صبا سے ملتا ہے

بھنور کو، آندھیوں کو دوش کس طرح میں دوں
برا تو ڈوبنے کا ناخدا سے ملتا ہے

نوؔید ایسے قبیلے سے ہوں میں وابستہ
جہاں خلوص کا بدلہ جفا سے ملتا ہے

غزل

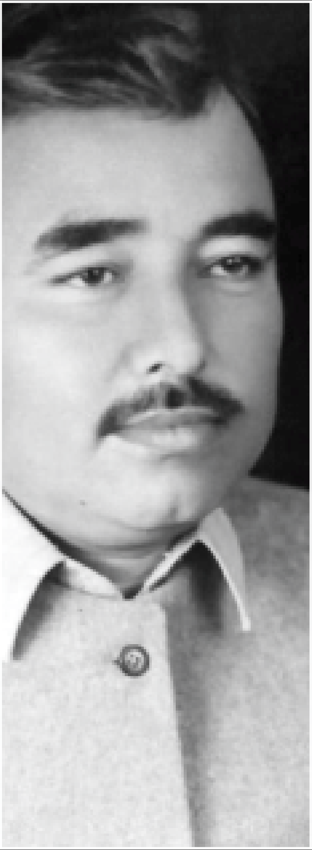

نت نئے ڈھنگ سے نکھرتی ہے
اس کی دیوانی ساری دھرتی ہے

ایسے گزری ہے زندگی اپنی
جیسے ڈی چوک میں گزرتی ہے

کر کے سرکار کی طرح وعدے
ہاتھوں ہاتھوں پہ وہ مکرتی ہے

گھر میں اس کی ہے اس طرح گزری
جیسے پردیس میں گزرتی ہے

اہلِ دل سے کہاں سنبھلتے دل
اس ادا سے وہ کچھ سنورتی ہے

چاند بھی چودھویں کا شرمائے
سیڑھیوں سے وہ یوں ابھرتی ہے

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزل

کیا ہو صورت گری اداسی کی
ایسی سہمی ہوئی اداسی کی

کوئی تصویر کیا بنائے گا
دل کے اندر بسی اداسی کی

جسم و جاں ساتھ بھیگتے ہیں
لگ گئی ہے جھڑی اداسی کی

شاخِ امید سے جھڑے پتے
جب ہوا چل پڑی اداسی کی

گم ہوا میرا غم شناس کہیں
اک پرت جب ہٹی اداسی کی

قہقہوں میں اسے اڑاتا رہا
میں نے جو بات کی اداسی کی

کچھ نہیں نغمۂ طرب کی خبر
سنتی ہوں راگنی اداسی کی

پاؤں میں راحتوں کو رولتا ہے
جس کو لت لگ گئی اداسی کی

میں نے تصویر کھینچی ہے جیا
راستے میں کھڑی اداسی کی

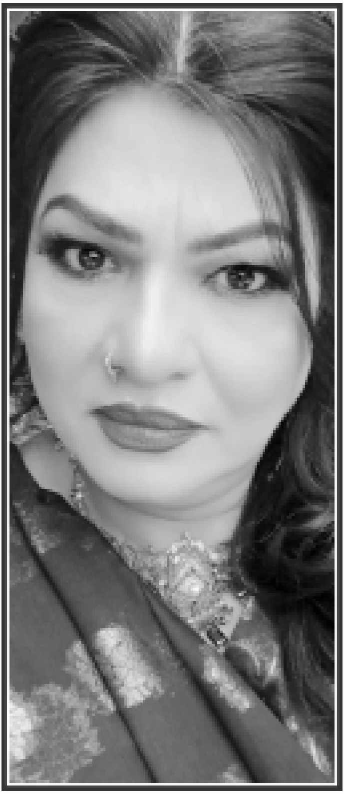

جیا قریشی

غزل

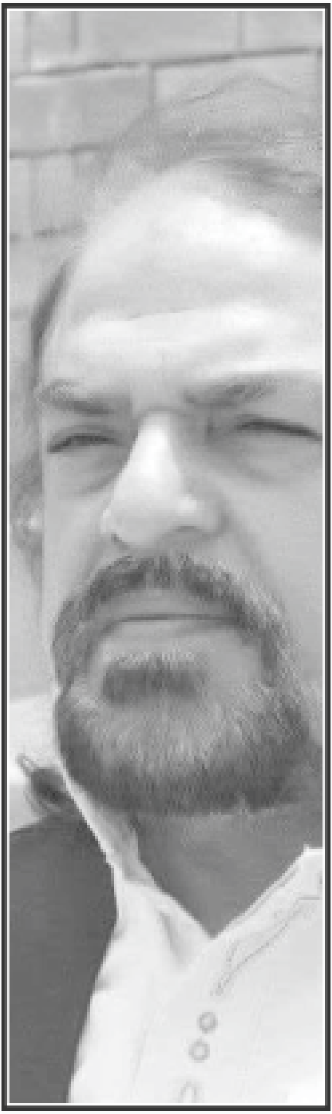

دیارِ عشق کو تسخیر کر لیا گیا ہے
جو خواب تھا اسے تعبیر کر لیا گیا ہے

سنا ہے عہدِ رواں میں قدیم نسخوں کو
جدید طرز پہ تحریر کر لیا گیا ہے

مری بساط سے باہر نکل گیا تھا جو
وہ عذرِ جبر سے تعبیر کر لیا گیا ہے

وہ جیسا گھر مرا اسلاف کی نظر میں تھا
نئی تراش پہ تعمیر کر لیا گیا ہے

کسی کے پاس کوئی علتِ فرار نہیں
اب اختصار بھی تفسیر کر لیا گیا ہے

سبک خرام تو دستِ ستم میں آیا نہیں
جو سست رو تھا وہ نخچیر کر لیا گیا ہے

زباں کو حرص و ہوس نے کیا ہے زندانی
قلم کو ظلم سے جاگیر کر لیا گیا ہے

تجھے خبر نہیں کیا ہاتھ ہو گیا احمدؔ
کہ تیری فکر کو زنجیر کر لیا گیا ہے

احمد ساقی

غزلیں

توڑ دی میں نے آخری توبہ
ہائے توبہ مری، مری توبہ

خوب صورت گناہ کرتے ہوئے
ہم کو اچھی نہیں لگی توبہ

اب مرے سامنے نہ آیا کر
میں نے کی ہے نئی نئی توبہ

ایک زاہد کا دیکھ کر کردار
سچ کہوں میں نے چھوڑ دی توبہ

وہ بھی بخشش کے انتظار میں ہے
جس نے کی ہے نمائشی توبہ

سانس میرے اکھڑ رہے ہوں گے
تب کروں گا میں دائمی توبہ

ہے گناہوں کو چھوڑنا مشکل
ورنہ آسان ہے بڑی توبہ

ایک توبہ کو توڑ کر قیصرؔ
روز کرتا ہوں دوسری توبہ

قیصر مسعود

دیکھنے میں کہیں نہیں ہوں میں
درحقیقت یہیں کہیں ہوں میں

دھڑکنوں میں شمار کر مجھ کو
تیرے دل کے بہت قریں ہوں میں

تُو مرا اعتبار ہے لیکن
حیف تیرا یقیں نہیں ہوں میں

مجھ میں اُگتی ہیں جھاڑیاں غم کی
کوئی اُجڑی ہوئی زمیں ہوں میں

مجھ پہ کُھلتے ہیں راز فطرت کے
وادیٔ حُسن کا مکیں ہوں میں

تم محبت کی اولیں صورت
اور آوازِ آخریں ہوں میں

اس جہانِ وجود میں قیصرؔ
کیا خبر ہوں بھی یا نہیں ہوں میں

غزلیں

سمیع اللہ عرفی

ہوں وہ تہذیب جو کھنڈرات میں زندہ ہے کہیں
میرا ماضی بھی مری ذات میں زندہ ہے کہیں

اس کی آنکھوں میں جوابات کو پڑھ سکتا ہوں
جو مری چپ کے سوالات میں زندہ ہے کہیں

اس کو جب چاہوں میں دریافت بھی کر سکتا ہوں
کسی پتھر وہ کسی دھات میں زندہ ہے کہیں

کوئی بھٹکے جو اندھیرے میں تو وہ خضر بنے
وہ تو جگنو ہے ہر اک رات میں زندہ ہے کہیں

اس کو مرحوم میں لکھتے ہوئے ڈر جاتا ہوں
وہ جو شعروں میں مری بات میں زندہ ہے کہیں

عرفی جب چاہوں میں تصویر بنا لوں اس کی
میں مصور ہوں مرے ہات میں زندہ ہے کہیں

میر اسلم حسین سحر

ظلمت میں روشنی کا مزا ہم سے پوچھیے
دشمن سے دوستی کا مزا ہم سے پوچھیے

چہرہ گلاب، زلف سیاہ، آنکھ جھیل سی
پھولوں کی تازگی کا مزا ہم سے پوچھیے

بس عاشقی میں لٹتے رہے آئے روز ہم
ان کی ستم گری کا مزا ہم سے پوچھیے

ٹھکرا کے آ گئے ہیں سمندر کو آج ہم
تکریم تشنگی کا مزا ہم سے پوچھیے

اس نے ستایا ہم کو سحر بے سبب سدا
قسطوں میں خودکشی کا کا مزا ہم سے پوچھیے

غزل

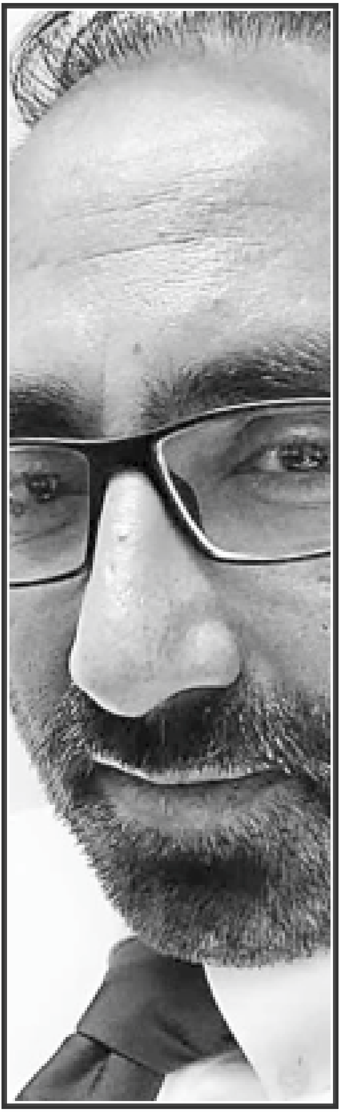

مٹی نم ہو تو اُگ آئیں گندم اور گلاب
ورنہ دشت کی پہنائی میں سارے خواب سراب

رات طلسمی لوح پہ کندہ ہوتی اک تمثیل
کوئی مسافر گم گشتہ اور کوئی ستارہ یاب

گونج اٹھی پھر نیل گگن پر ٹاپوں کی آواز
کون چلا یہ زین سے باندھے انجم اور مہتاب

سیاروں کے رقص میں کوئی دیکھے تو یہ جشن
تاروں کی قندیل سے روشن راتوں کی محراب

شاہ ولایت کے کشکول میں مشرق کی تہذیب
لندن کی گلیوں میں جیسے یوپی اور پنجاب

صحراؤں کو گلشن کرتے دریا روپ سروپ
دھرتی کے سینے کی رونق سندھو اور چناب

یاد کرو بس ایک کنوارے بوسے کا اعجاز
قصہ خود تصویر کرے گا مینڈک اور تالاب

اپنے خون کی خوشبو ہو گئی مٹی میں پیوست
جب جب ہم نے نہر کنارے خیمے کے طناب

عابد رضا

غزل [نذرِ قمر جمیل]

کون سی کہکشاں سے آئے ہیں
یہ ستارے کہاں سے آئے ہیں

رات کی گود میں ستاروں کے
یہ اشارے کہاں سے آئے ہیں

باغ اُجڑا تو نوحے پڑھتے ہوئے
زرد پتے خزاں سے آئے ہیں

دھوپ کے راستے پہ چلتے ہوئے
ہم نئے امتحاں سے آئے ہیں

کون در کھولتا رہا چپ میں
یہ دریچے کہاں سے آئے ہیں

گردِ رہ کی خبر سناتے ہوئے
ہم جو صحرا نشاں سے آئے ہیں

آنکھ میں عکس ٹوٹے خوابوں کے
یاد کے کارواں سے آئے ہیں

یہ صدا کس چراغِ دل کی ہے
کس دعا کے مکاں سے آئے ہیں

یاد کے زخم بھرنے والے تھے
پھر یہ آنسو کہاں سے آئے ہیں

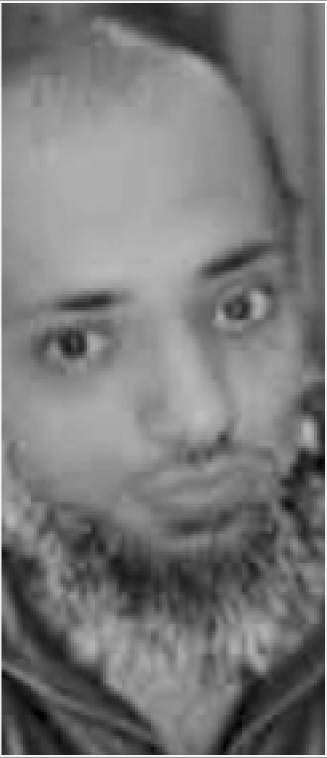

رؤف ساحر

غزل

سوئے زمیں ـــــ کہ بر سرِ افلاک دیکھیے
آنکھیں ہی جب نہیں ہیں تو کیا خاک دیکھیے؟

الزام کس کو دیجیے بے چہرگیء زیست؟
کوزہ گروں سے پوچھیے کہ چاک دیکھیے؟

کوئی بھی پھول شاخ پر باقی نہیں رہا
فصلِ خزاں ہے کس قدر سفاک دیکھیے

خوش ہوں کہ سُرخ رنگ مجھے راس آ گیا
میرے لہو میں تر مری پوشاک دیکھیے

اُس آنکھ میں اُتر کے بھی میں ڈوبتا نہیں
مجھ سا یہاں پہ کون ہے تیراک دیکھیے

مجنوں بھی اپنی ذات میں سقراط بھی ہوں میں
وحشت بھی دیکھیے ، مرا ادراک دیکھیے

شہباز کوئی کھینچ رہا ہے زمین کو
گرتا ہے کب یہ خیمہء افلاک دیکھیے

شہباز خواجہ

غزل

محبت استعارا ہے زمیں کا
ترا چہرہ ستارا ہے زمیں کا

پہاڑوں سے کبھی راتوں کو دیکھو
فلک جیسا نظارا ہے زمیں کا

جو ہم مٹی میں آنسو بو رہے ہیں
کوئی قرضہ اتارا ہے زمیں کا

فقیروں کی قبا بھی ہے بگولہ
بگولہ بھی غبارا ہے زمیں کا

فقط نقشہ نہیں بدلا ہے میں نے
مقدر بھی سنوارا ہے زمیں کا

سبھی سامان چھوڑے جا رہا ہوں
سفر کوئی دوبارہ ہے زمیں کا

سرفراز تبسم

غزل

جینا ہے گر جہاں میں تو ہے پیار لازمی
ہوتا ہے یہ سبھی کو ہی اک بار لازمی

ڈرپوک تھے نہ کر سکے اظہارِ عشق ہم
کھویا تو آیا ہوش کے اظہار لازمی

خود کو میں دیتی ہوں یہ تسلی کہ دنیا میں
ہر کھیل میں ہے جیت کہ بھی ہار لازمی

وہ اس قدر حسین ہے نظریں ہی نہ ہٹیں
شاعر پہ تو ہو جائیں گے اشعار لازمی

وہ ہے کمال اس کو ملیں سب ہی بار بار
ہو جاتا ہے سبھی پہ ہی دیدار لازمی

دنیا کی باگ ڈور مجھے یہ سکھا گئی
جینے کے واسطے ہونا ہشیار لازمی

یارو نہیں ہیں عشق کے آسان راستے
یہ عشق تو ہے مانگتا ایثار لازمی

گر ایک بار دیکھ لے تجھ کو حسن پرست
اس کو ترا ہو جائے گا خمار لازمی

یہ عمر کٹ رہی ہے مری تب تلک رشا
ہوتا رہے جو یار کا دیدار لازمی

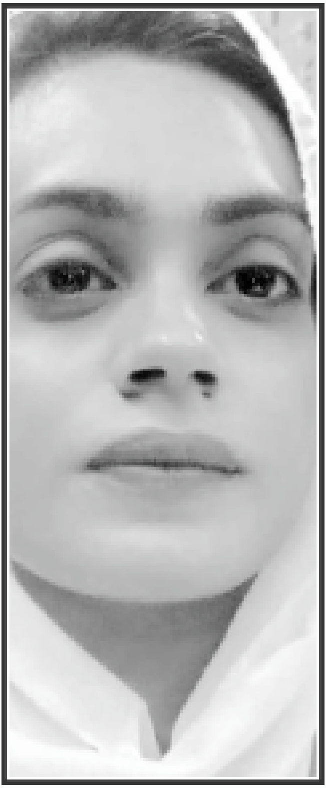

رشا شیخ

غزل

مجھے دکھایا گیا تھا جو روشنی کا نشاں
مری سکت سے کہیں بڑھ کے ہے وہ تیرہ مکاں

کسی نے یاد دلایا کہ زندگی کا فسوں
بہت دنوں سے نہیں ہے برائے گم شدگاں

پلٹ پلٹ کے مری سمت دیکھنے والے
ترے بغیر مرے کون کام کا یہ جہاں

ستم تو یہ بھی بہت ہے مری خرابی کو
تمام لوگ مرے حال پر ہیں گریہ کناں

نوید! یہ بھی بہت ہے کہ چل چلاؤ میں
میں اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں کون و مکاں

نوید صادق

غزل

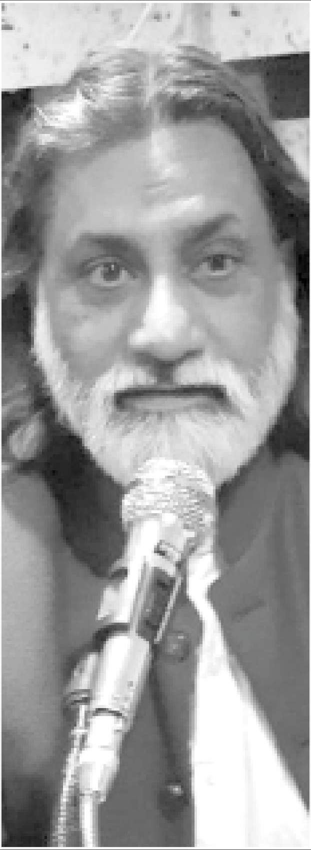

اعجاز رضوی

ایک دو خواب ہیں اور ایک دو تعبیریں ہیں
مختلف پوز میں تنہائی کی تصویریں ہیں

دیکھ میں تیرے لیے قافلہ چھوڑ آیا ہوں
تو بتا اور میری کون سی تقصیریں ہیں

پھول ہاتھوں میں نہیں آنکھ میں مرجھاتا ہے
یہ ترے حرف نہیں پاؤں کی زنجیریں ہیں

ظاہری طور پہ میں توڑ چکا ہر ناطہ
پر میری میز پہ کچھ شعر ہیں تحریریں ہیں

تو مجھے کون سی بوٹی کا پتہ دیتا ہے
عشق تریاق ہے تریاق کی تاثیریں ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چار سو، اک برف بستہ عہدِ نم کا راج ہے
دھوپ میں حدت نہیں، دریاؤں میں پانی نہیں

غنی خان

جنوری 1965 کو گورنمنٹ کالج پشاور میں لیکچرر ان فلاسفی کے طور پر میری پوسٹنگ ہوئی تو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ رہنے کے لیے کیا بندوبست کرنا ہوگا۔ میں کہ ایک دیہاتی آدمی تھا اور اب بھی ہوں، دوسرے دیہات کی طرح میرے گاؤں میں بھی ہر مکان کچا تھا سوائے خدا کے گھر کے کسی کا گھر ڈبل سٹوری نہیں تھا۔ پشاور گلیاں تنگ اور گھر کئی منزلہ جو دفاعی نقطہ نظر سے ہونا چاہیے تھے لیکن میرا دم گھٹتا تھا۔ کالج شاہی باغ کے ایک کونے میں کھلی فضا میں تھا لیکن کوئی ہاسٹل نہیں تھا۔ طلباء مقامی تھے انھیں ہاسٹل کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لیے کوئی جگہ پرکشش تھی تو وہ اسلامیہ کالج اور یونیورسٹی کے کیمپس تھے۔ سارا ماحول علمی تھا۔ سٹاف کے لیے بنگلوں کے علاوہ بیچلر ہاسٹل بھی ہے۔ اسلامیہ کالج کے مغربی سامنے تہکال کے ارباب عبدالواحد کا ایک ہوٹل تھا جس کا ایک کمرہ میں نے کرایے پر لے رکھا تھا۔ دس بارہ سال پہلے وہاں سے گزر ہوا تو اس پر اقرا یونیورسٹی کا بورڈ لگا دیکھا۔ چار کمرے اوپر اور نیچے ہال اور یونیورسٹی؟ تہکال تھانے کے پاس اسلامیہ کالج کی ملکیت قلعہ ہری سنگھ بھی تھا اس میں بھی کالج کے کچھ سٹاف ممبر رہتے تھے۔ غنی خان سے پہلی بار میں یہیں سے متعارف ہوا۔

عصرِ حاضر کے پختون نوجوان غنی خان کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے مثال مصور اور لائق فائق انجینئر بھی تھے، بنگلہ زبان کے نوبل انعام یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی درس گاہ شانتی نکیتن سے فارغ التحصیل تھے۔ پشتو تو تھی ان کی اپنی زبان اردو، انگریزی بھی فرفر بولتے تھے اور فارسی زبان سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ ایک نشست میں مجھے غور سے

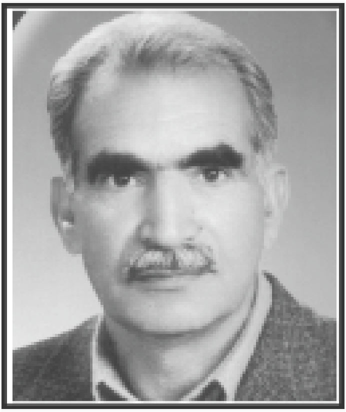

محمد ارشاد

دیکھنے لگے میں قدرے گھبرایا، آیا میرے منہ پر کوئی کھانے کی چیز لگی ہے جو میں صاف نہیں کر سکا۔ کہنے لگے ارشاد مصوری کے نقطۂ نظر سے تمھارے چہرے کا سائڈ پوز بہت اچھا ہے لیکن تمھاری مونچھیں گڑ بڑ کر رہی ہیں۔ پاس لارنس کالج گھوڑا گلی کے پڑھے ہوئے صاحبزادہ فاروق بیٹھے ہوئے تھے اور مصوری جانتے تھے میری تصویر بنادی۔

البتہ ایم ڈی تاثیر کی اردو شاعری کی کتاب (نام یاد نہیں آ رہا، میرے پاس پڑی تھی، اس ایک نظم 'دیوداسی' پر تھی۔ ہندو مندروں میں دیوداسیاں پجاریوں کی ''خدمت'' کے لیے ہوتی ہیں۔ مسیحی مذہب میں Manasteries میں Monks اور nuns اگرچہ کہنے کو ''کنوارے'' ہوتے ہیں کہ یسوع مسیح کنوارے تھے یہ بات ان کی سنت تھی لیکن فطری داعیہ کے آگے بند باندھنا محال ہے مسلمان بھی اسی راہ کے راہرو ہیں قاریوں کی بچوں کے ساتھ بدفعلیاں وہ بھی مسجد میں اپنی ایک تاریخ رکھتی ہیں۔ متعہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ قصہ کوتاہ غنی خان نے دیوداسی کا ایک کاغذ پر سکیچ بنایا اور اس چہرے کے تاثرات دیکھنے والوں کے دل میں ہمدردی کے تاثرات پیدا کرتے تھے۔ مصور کے اس شہکار کو میں نے فریم کروا کے رکھا تھا لیکن دیگر تقریباً سات ہزار کتابیں دیمک کے حملے میں ضائع ہو گئیں۔

ایک مشاق مصور کے علاوہ غنی خان باکمال انجینئر بھی تھے۔ کئی ایکڑ گنے کے کھیت میں تین گنوں میں شوگر کی مقدار کی بنیاد پر یہ معلوم کر سکتے تھے کہ کھیت میں موجود فصل سے کتنا گنا گڑ یا شکر بنانی ممکن ہے۔

پاکستانی سیاست پر میں نے انھیں گفتگو کرتے کبھی نہیں سنا ہر چند 1937 کے الیکشن میں کامیاب ہو کر متحدہ ہندوستان کی پارلیمان کے رکن رہ چکے تھے۔ ان دنوں گائے کے ذبیحہ پر پارلیمان کے اندر اور باہر ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔ مسلمان یوں بھی گوشت خور ہیں اور پٹھان گوشت خوری میں سب سے آگے ہیں۔ ان دنوں کی یاد آوری میں کہنے لگے میں نے گائے کے ذبیحہ کے حق میں تقریر کی۔ میری تقریر کے جواب میں ایک ہندو ممبر کھڑا ہوا اور کہنے لگا آپ لوگ سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے۔ میں نے جواباً کہا اس لیے کہ وہ گند مند کھاتا ہے۔ ہندو ممبر نے کہا: تو مرغی کیا ربڑی کھاتی ہے؟ اپنی ہار پر غنی خان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پوری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ربڑی اردو

بولنے والے مہاجرین نے پاکستان میں متعارف کی۔ کراچی سعید منزل کی دودھ کی دکان کی سپیشلیٹی تھی - نہایت لذیذ ڈش ہے۔ میں گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی کی بات کر رہا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غنی خان کا شمار پشتو کے اجلّہ میں ہوتا ہے اور سوشل میڈیا پر ان کے اشعار بھی وائرل ہوتے رہتے ہیں۔

ایک کم عقل نوجوان نے غنی خان کے ایک شعر کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔ شعر تو مجھے یاد نہیں آرہا پر جس طرح نام نہاد شعر سنا میں نے درج کیا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ:

میں خدا کی عقل پر حیران ہوں کہ چل تو دوزخ کے راستے پر رہا ہے اور جنت پہنچنے کا امیدوار ہے۔ یہ شعر پڑھ میں نے سر پکڑ لیا غنی خان نے مولا لکھا ہوگا۔ مولا کی میم پر پیش نہیں ڈالی ہوگی۔ عقل سے عاری قاری مُولا کو مَولا پڑھا اور مطلب خدا نکال لیا۔ پشتو میں مُلّا کو مُولا کہا جاتا ہے۔

پشتو زبان کی اپنی بحور و اوزان ہے۔ یہی پنجابی زبان کا ہے۔ اردو اور فارسی شاعری کی بنیاد عربی بحور و اوزان پر ہے۔ غنی خان فارسی زبان سے بخوبی آگاہ تھے لیکن اوزان شعر پورے طور پر آگاہ نہ تھے۔ ایک موقع پر نجانے کس ترنگ میں آکر میں نے اپنا شعر سنایا:

سجدہ بیک خدائے خلق نہم بجبیں گراں نبود
لیک سرِ نیاز من مسجود مشترک نخو است

....

غنی خان اُٹھے اور مجھے گلے لگایا۔ انھیں یہ پتہ نہ چلا کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں فاش عروضی سقم موجود ہے۔ مسجود مشترک کو سجدۂ مشترک یا مسجد مشترک کر دینے سے یہ سقم دور ہو جاتا ہے لیکن مسجود سے جو معانی مراد تھے بدل جاتے۔

غنی خان فری اور فرینک آدمی تھے۔ ہر وقت موج مستی میں رہتے تھے لیکن حواس قابو میں رہتے۔ کسی بات پر انھیں غصہ کرتے اور اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ ایک موقع پر میں نے انھیں یہ کہتے سنا کہ بابا میرا رشتہ اندرا گاندھی سے کرنا چاہتے اور پنڈت نہرو یہ رشتہ منظور بھی کر چکے تھے۔ میں نے بابا (عبدالغفار خان) سے کہا مجھے ایک لڑکی روشن زیادہ پسند ہے اس سے رشتہ نہ ہوا تو اندرا سے شادی کر لوں گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اندرا کی شادی بھی فیروز سے ہوئی جو پارسی تھا۔ اگر اندرا اور غنی خان کی شادی ہو جاتی تو انڈیا اور پاکستان کے سیاسی حالات کیا رُخ اختیار کرتے اس پر سوچا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اپنی ہوئی پرائی

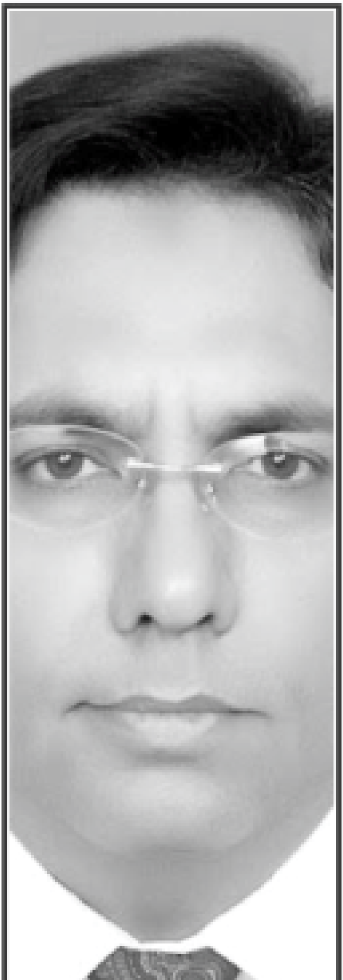

علی رضا احمد

جب کسی دوسری زبان کا لفظ اپنی زبان میں مجبوراً شامل کیا جاتا ہے تو اسے اپنی زبان کی شکل دینے کے لیے اس کا کم از کم ایک لفظ خاموش (silent) کروا دیا جاتا ہے تا کہ ان الفاظ کو خوابوں کی دنیا سے باہر نکالا جا سکے- جیسے اردو میں خواب اور خواہش کے واؤ کو خاموش کرا دیا گیا ہے- ایسے ہی انگریزی میں دوسری زبانوں سے مستعار لئے گئے الفاظ میں سے ایک آدھ حرف کو چپ کرا کے یا پھر اس کی ادائیگی کا چہرہ بگاڑ کر اور پھر اپنے غصے کو calm کر کے کچھ اوور write کر لیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ طالب علموں کو جیسے کسی زبان کی know how ہی نہیں ہے- کئی دفعہ جملہ لکھ کر خود بھی درخواست کر دی جاتی ہے کہ

Boys like "tall" girls

but T is silent

ویسے T کو often ہی خاموش کرا دیا جاتا ہے اور کبھی ایک ہی word میں دو دو الفاظ کو بھی ---- اگر غلطی سے کہیں Silent حرف کو اس لفظ میں شامل کر دیا تو سمجھیں انگریزی پسند سے آپ کی

"wrestling" شروع.....

کہیں یہ لکھ دیا جاتا ہے ہماری محکمانہ ترقی میں انتظامیہ silent ہے۔ کہیں یہ لکھا ملتا ہے" آئی لو یو" میں you ہی کیوں خاموش رہتا ہے۔ کچھ طالب علم یہ سوال بھی پوچھ لیتے ہیں English کو اردو میں انگریزی کہتے ہیں مگر اُردو کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ کیا کیا جائے ہر سوال کا جواب اگر" آئی لو اُردو" ہو تو معاملہ کول ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ آئین میں اسی لئے لکھا ہے کہ

"The national language of Pakistan is Urdu"

تقریباً دو عشروں قبل میں نے اپنے مضمون میں یہ جملہ لکھا تھا" ٹو بی ویری فرینک۔ میں ان لوگوں سے سخت hate کرتا ہوں جو اپنی باتوں میں انگلش word s یوز کرتے ہیں nonsense کہیں کے"

یہ واحد جملہ ہے جس سے وقار مجروح نے اختلاف نہیں لیا بلکہ اس نے یہ پڑھ کر پشتو میں قہقہہ بھی لگایا تھا... یہ بات اہم ہے کہ کسی بھی زبان کی مضبوطی کے لیے دو چیزیں ضروری ہوتی ہے ایک اس کی گنتی دوسرے حروف تہجی کا script-

Pardon me کہنے کے بعد وقار مجروح کہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سن 1600 تک انگریز ایک جاہل قوم تھی جس کا علم و بیان اور حساب سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ گنتی اپنی نہ حروف تہجی ہی اپنے تھے بلکہ لفظ England بھی جرمنی کے کسی لفظ سے ہی بغیر ویزے کے یہاں انگلستان پہنچا تھا اور یہ انگریزی منگے تنگے عرف بے ڈھنگے کی زبان بن گئی تھی۔

یہ بات سچ ہے کہ ایک دور تھا جب انگریزوں کے پاس اپنی گنتی بھی نہیں تھی پھر انہوں نے (Divide and rule) ضرب لگا کر تقسیم کرنے کے لیے گنتی رومن سے لی جس کے ہندسوں سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ بذات خود زمانہ جاہلیت کے ہیں اور وہ آج بھی گھڑیوں کے ڈائل پر نظر آتے ہیں۔ یعنی ایک ڈنڈی یا دو اور 3 لکھنے کے لئے تین ڈنڈیاں۔ چار لکھنے کے لئے V لکھ کر ایک ڈنڈی کم۔ کسی کو دس نمبری لکھنا ہو تو X (ایکس) لکھ دیں۔ اور 9 لکھنے کے لیے X کے الٹے ہاتھ ایک کم کر دیں۔ ہماری دادی بھی کچھ ایسے ہی حساب لگایا کرتی تھی۔ اٹھانوے کو دو کم سو کہتی تھی اور باون کو 2 زیادہ پچاس کہہ کر سمجھا دیا کرتی تھی۔

آج بھی conservative لوگ

2K25 لکھتے ہیں- وقار مجروح کہتا ہے آپ گنتی کی بات کرتے ہیں گنتی کے حروف کو ڈیجٹ یا نمبر کہتے ہیں یہ دونوں لفظ Latin سے لیے گئے ہیں بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ .... Count .... Minus .... Plus Total....Figure... بھی انگریزی کے الفاظ نہیں French ہیں- موجودہ انگریزی میں شامل گنتی بھی برصغیر اور عربوں نے مل کر ایجاد کی تھی اسی لیے اس کے Alphabets "ہندسہ" کہلائے-

جیسے گنتی گانا اور گالی اپنی زبان میں مزا دیتی ہے جبکہ کسی بھی جملے کا پہلا اور آخری لفظ اس کی اصل زبان کی نشاندھی کرتا ہے- سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ایک بات عرض کرتا چلوں وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا Script یعنی اس کی ABCD کی حروف تہجی بھی یونان سے سو سالہ Lease پر لی گئی تھی اور گورے اب تک اس پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں lease بھی اسی زبان کا لفظ ہے- تعلیم سے تو برطانیہ کے گوروں کا دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا اگر ہوتا تو Education فرنچ سے نہ لیا جاتا-

حیرت ہے جس قوم کے پاس فیل، پاس، رزلٹ اور Education جیسے الفاظ مستعار ہوں ان کا تعلیمی معیار کیسے آگے بڑھا ہوگا اور جس زبان میں minute,second,hour, جیسے الفاظ ہی اپنے نہیں ان کو اپنانے والوں کو وقت کی اہمیت کا سبق کس نے دلایا ہو گا؟ اگر فیل اور پاس کے الفاظ بھی انگریزی کے نہیں تو یہ کامیابی اور ناکامی کا تعین کیسے کرتے ہوں گے- آپ لفظ Lesson یاد رکھیں کہ یہ لفظ فرانسیسی ہے-

گوروں کو ادھر ادھر قبضے کر کے اتنا علم ہو گیا تھا کہ درخت پر لگنے والے ہر گول مٹول پھل کو بیری کہتے ہیں- ان کے اپنے ملک میں تو برف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے ہر پھل کے ساتھ بیری لکھنا شروع کر دیا جو بھی زمین کے باہر درخت پر لگتا تھا- سٹرابیری ہو یا بلو بیری وغیرہ اور زمین کے اندر جتنی بھی مصنوعات پیدا ہوتی ہیں یہ اس کو Nut کہتے ہیں ہیں جیسے گراونڈ نٹ وال نٹ وغیرہ..... لفظوں کی کسی زبان میں شمولیت پر حیران ہونا ضروری نہیں ہے لفظ شکریہ کے بارے میں سنا ہے کہ یہ اُردو میں پہلی دفعہ انیس سو ستر میں میں شامل کیا گیا تھا-

کوئی آپ کو یہ کہے کہ آپ نے انگریزی کا

فلاں لفظ کا تلفظ صحیح ادا نہیں کیا یا آپ کا Accent یا pronunciation صحیح نہیں ہے کیا اس بات پر ماتم نہ کیا جائے کہ یہ دونوں الفاظ Latin ہیں- لفظ Lazy جرمن زبان کا لفظ ہے اس سے ثابت ہوا کہ گوروں کے ہاں ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ وہ ست سے سست شخص کو بھی کوستے تک نہیں ہوں گے کیونکہ یہ اس معاشرے کے لوگوں کی ایک عام سرشت ہو گی- اس لئے ان کے بزرگ نوجوانوں کو یہ تلقین کرتے ہوں گے اور حرام خورو

"Make hay while the sun shines"

کہا جاتا ہے انگریزی سیکھنے سے پہلے گرائمر سیکھنا ضروری ہے اور گرائمر بھی انگریزی کا لفظ نہیں ہے- انگریزی کا باقاعدہ کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے جس سے طالب علموں کو الفاظ کا تلفظ سکھایا جا سکے- بس اس کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اک حسینہ ہے اور اس کی اپنی ایک اداء ہے- کہیں C کو K کی آواز نکالنا بھی پڑ جاتی ہے اور کہیں E کو آئی کی- جب غیر ملکی الفاظ اپنی زبان میں شامل کیے جائیں گے تو Pecific Ocean کی C تین قسم کی ہی آواز نکالے گی- یوں اس لحاظ سے اردو کا قاعدہ زیادہ فصیح الزبان ہے اور وہ اپنی زبر زیر سے پیش پڑھاتا ہے- وقار مجروح کہتا ہے میرا بس چلے تو میں "آئی" اور U کو ساتھ ملا دوں....

یہ ٹیچر کی صوابدید پر ہوتا ہے اور وہ یہ کہہ کر بھی آپ کا نمبر کاٹ سکتا ہے کہ Good کا پہلا O دوسرے سے چھوٹا کیوں لکھا ہے- یہ واحد مستعار لی گئی زبان ہے جس میں کیپٹل لیٹرز کو بھی اہمیت حاصل ہے-

ایک فنانس منیجر کے لیے بلائے گئے انٹرویو میں پوچھا گیا تھا England کا کیپٹل کیا ہے؟ سارے بچے فیل ہو گئے- بعد میں ممتحن نے واضح کیا کہ سوال آسان تھا مگر طالب علم ایسے ہی پریشان ہو گئے حالانکہ جواب E تھا-

انگریزی کے کئی الفاظ کے پیشہ کے حساب سے علیحدہ معنی ہوتے ہیں جیسے custom کے معیشت اور معاشرے کے لئے مختلف معانی ہوتے ہیں اسی طرح میڈیکل اور قانون میں Procedure اور Pulse اور اسی طرح لفظ Civil کے الفاظ ہیں- بقول وقار مجروح ان کے انگریزی کے پروفیسر پیر جمعہ بخش کا اگر انگریزی ترجمہ کیا جائے تو یہ بنتا ہے (The Donation Friday)

from Monday to

انگلستان کے برفانی ماحول میں کوئی پھل وغیرہ کم ہی ہوتا ہے اس لیے سارے پھل berry کہلاتے ہیں اور ساری دالوں کو bean کہا جاتا ہے۔ چلیں شروع کر لیتے ہیں Strawberry, blue berry اور دوسرے طرف kidney bean, soybean, black bean یوں انگریزی کو بھی "Full of beans" نہیں کہہ سکتے۔

وقار مجروح نے ایک مضمون The Way لکھا تھا جسے سب پنجابی کا "دیوے" "سمجھتے رہے The Wall کو دیوار۔ ویسے جوا اور بالنگ کھیلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے حالانکہ یہ صرف لفظوں کا کھیل ہے۔

کسی شئے کا کسی زبان میں کوئی لفظ ہو تو اس سے خطے کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ اگر اردو میں آم کے پھل کا ذکر ہے تو سمجھ آتا ہے کہ اس علاقے میں یہ پھل بھی ضرور ہو گا۔ برطانیہ ایک سرد علاقہ ہے ظاہر ہے یہاں آم کاشت نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اس علاقے کا پھل ہے انگریزی میں پھر بھی اسے Mango کہتے ہیں جو پرتگالی زبان Manga سے نکلا ہے۔ گوروں کے دماغ کا اندازہ لگائیں کہ لفظ Brain جرمن زبان لیا گیا ہے اور Heart تو ہے ہی لاطینی....

آپ نے سنا ہوگا برطانیہ کا کوئی لکھا ہوا آئین نہیں ہے اور یہ آئین لکھا کیوں کر جاتا جبکہ لفظ Constitution بھی فرانسیسی ہے۔ ہر آئین میں قانون اور Laws ہوتے ہیں اور آپ کو حیرانی ہوگی لفظ Law بھی انگریزی کا نہیں ہے جرمنی کا ہے۔ انگریزی کے کچھ الفاظ خالص ان کے اپنے ہیں جن سے ان کے معاشرتی حالات ظاہر ہوتے ہیں ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیں....

You Clever boy Eat and Sleep, Kill him that mad man then Rest and Laugh

اب اس عالمی انگریزی زبان کی کسمپرسی کا فیصلہ کس Judge سے کروائیں اور جج کا لفظ بذات خود لاطینی بھی ہو اور جس میں D کو ویسے ہی خاموش کروا دیا گیا ہو کیونکہ عدالتی کارروائی میں بھی خاموشی درکار ہوتی ہے اور جج صاحبان عدالت میں silent "سائلنٹ" کی آوازیں لگا کر حاضرین کو چپ کراتے ہیں۔ وہ اس لیے بھی کہ جج نے Divorce dispute کا بھی Decision دیا

ہوتا ہے اور یہاں اپنی ساکھ کی Defence بھی کرنا ہوتی ہے۔ جج صاحب سے پوچھا گیا آپ ہی بتائیں جج میں ڈی کیوں silent ہوتی ہے انھوں نے فرمایا جس کالج سے میں نے Knowledge لیا وہاں تو نالج سے K اور D دونوں ہی silent تھے۔

انگریزی لکھنے میں اسپیس کا بھی بہت عمل دخل ہے ورنہ ایمان سے ہاتھ دھونے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایک گورے نے لکھا

The God is nowhere

حالانکہ اس نیک شخص نے لکھا تھا....

The God is now here

اب ہم اپنی اردو کی طرف آتے ہیں ذرا اس جملے پر غور فرمائیں....

"میں آفس سے نکل کر ٹیکسی پر سوار ہوا اور ریلوے اسٹیشن کے لیے رائیڈلی اور جلدی سے پلیٹ فارم پر پہنچ کر ٹرین کی بوگی نمبر 5 جو کہ انجن کے بالکل ساتھ تھی پہنچ کر میں اپنی ریزورسیٹ پر جا بیٹھا۔ بیگ کو سیٹ کے نیچے رکھا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ لیجیے! اسگنل ڈاؤن ہوا۔ گارڈ نے وسل بجائی۔ انجن سے ہارن کی آواز سنائی دی اور ڈرائیور نے ٹرین چلا دی۔ میں ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ چیک کروا کے اپنی ریزرو شدہ برتھ پر سوار ہو گیا پھر یاد آیا کہ موبائل کا چارجر بیڈ پر ہی بھول آیا ہوں" از راہ مہربانی آپ اس مختصر جملے میں انگریزی کے الفاظ تلاش کرتے جائیں مگر آپ کو محسوس ہوگا کہ جیسے یہ سب اردو کے ہی الفاظ ہیں۔ پاکستانیوں کی اردو سے خاص محبت ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ "سوری" کو بھی اردو میں قانونی طور پر شامل کر لیا جائے لیکن یہ پھر بھی انگریزی لہجے میں ہی منہ سے نکلتا ہے اور پھر میں "سوری" کہہ کر کر جان چھڑا لیتا ہوں۔ انگریزی میں اردو کے الفاظ اتنے نظر نہیں آتے اور پاجاما کے علاوہ بہت سے الفاظ officially شامل بھی نہیں ہوئے مگر محسوس ہوتا ہے کہ اس پر بھی کسی گورے منشا بم کا قبضہ ہے مگر اپنی اردو پرائی ہو چکی ہے لیکن ایسا نہیں ہے! اب سمجھ آئی ہے کہ اردو میں جو الفاظ ہم نے انگریزی والے شامل کر رکھے ہیں وہ تو بذات خود انگریزی کے نہیں ہیں۔ آپ محسوس کریں گے انگریزی اور اردو دونوں زبانیں ہی ناتواں ہیں اور نوزائیدہ ہیں اس لحاظ سے پنجابی کا شمار قدیم زبانوں میں ضرور ہوتا ہے۔ میرے خیال میں گوروں کا یہ اصول ہے First occupy then clarify....

☆☆☆☆☆

شجرِ خسرو کے سائے میں دبے ہوئے نہالانِ ریختہ

امیر خسرو (۱۲۵۳ء – ۱۳۲۵ء) اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور موسیقار تھے۔ نکتہ شناسی، بلند فکری اور شیریں زبانی میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی اُفتادِ طبع کے زیرِ اثر اُس وقت کی ایک اُبھرتی ہوئی زبان کو اظہار کے لیے منتخب کیا جسے رابطے کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ یُوں وہ اُفقِ اُردو پر سُورج کی پہلی کرن کے طور پر نمودار ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو ہندوی شاعری کی بالکل اِبتدائی شکلیں ہمیں بابا فرید اور اُن سے پہلے کے شعرا کے کلام میں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن ہندوی غزل کا پہلا باقاعدہ شاعر اِن میں سے کسی ایک کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خسرو سے منسوب کردہ کلام کی ہیئتیں خاص اُنھی کی ایجاد تھیں۔ اُنھوں نے بہت کچھ زبان کو دیا جس کی پیروی میں بعد میں آنے والوں نے کی۔ وہ غیر معمولی ذہانت کے شاعر ہیں اور ایک پُوری تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاریخی تعصبات اُن کی شخصیت اور کارناموں کو دُھندلا نہیں سکتے۔

خسرو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن سے پہلے کسی نے اِتنی تعداد میں ہندوی الفاظ اِستعمال نہیں کیے۔ ہندوی طرز کے محاوروں کا برتاؤ بھی خسرو کو ایک جداگانہ حیثیت عطا کرتا ہے۔ ٹھیٹھ ہندوی الفاظ سنسکرت بحروں میں باندھنے کے علاوہ سب سے پہلے فارسی بحریں ہندوی میں رائج کرنے کا اعزاز بھی اُنھی کو حاصل ہے۔ اُن کے ہندوی کلام میں ایک روانی ملتی ہے جو آگے چل کر ہندوی زبان کی ترقی کی اساس بنی آیئے خسرو کے اُس ریختہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جسے جزوی ہندوی غزل کے نام سے پکارا جا سکتا ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زُلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

خاور اعجاز

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

....

خسرو اُردو کے اوّلین محسنین میں سے ہیں۔ اُن کے درج بالا اشعار سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ فارسی اور ہندوی کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے وہاں اِس حقیقت کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ اُس وقت کے ترقی پذیر معاشرے میں ایک ایسی زبان کی ضرورت کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی جو مختلف النوع تہذیبی پس منظر رکھنے والے لوگوں کے درمیان لسانی پُل کا کام دے سکے۔ امیر خسرو جیسا جامع کمالات پھر اس خطے کو میسر نہ آسکا۔ اُن کی طبیعت میں ایجاد و اختراع کا مادہ بے انتہا تھا۔ صرف شاعری میں اُن کی اختراعات کا جواب نہیں ہو پایا۔ اُردو کی بنیادیں اُستوار کرنے میں اُن کا جو بنیادی کردار ہے وہ اُنھی سے خاص ہے۔ اُن کی غزلیہ شاعری کو ہم ہندوی کے اوّلین نمونے تصور کریں گے۔ خسرو ہی کی بدولت بے نام زبان "ہندوی" کا نام اختیار کر کے "ریختہ" کے مرتبہ کو پہنچی اور اِسی پیوند کاری سے "اُردو" کا نیا شگوفہ پھوٹا اور باغِ ادب میں ایک ایسے پھول کا اضافہ ہُوا جو اَب خود گلستان ہے۔ لگتا ہے خسرو نے اپنی اختراعی طبیعت کے سبب ہندوی فارسی کا مِلا جُلا رنگ اختیار کیا جو اوّلاً عوامی حلقوں کے ساتھ ابلاغ کا ذریعہ بنا جس میں عوام میں مقبول گیتوں کا سا انداز پایا جاتا ہے جو بعد میں اپنی قبولیت کی وجہ سے اِتنا پھیلا کہ خسرو نے ہندوی شاعری کا ایک دیوان مرتب کر ڈالا، تاہم خسرو کے تفننِ طبع کے طور پر اپنائے جانے والے اس روّیے نے زبان و ادب کا نیا رُخ متعین کرنے میں بنیادی اور زبردست کردار ادا کیا۔

امیر نجم الدین حسن بن علا سجزی (۱۲۵۴ء۔۱۳۳۷ء) خواجہ حسن اور امیر حسن دہلوی کے ناموں سے معروف تھے۔ امیر خسرو کے ہم عصر اور پیر بھائی تھے۔ نظام الدین اولیا کی خانقاہ پر امیر خسرو سے روابط ہُوئے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے اور ان کا دیوان بعض جگہ درس میں شامل تھا۔ محافلِ سماع میں امیر حسن کی غزلیں گائی جاتی تھیں:

ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اُسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیو لائے کر

تا کے خورم خونِ جگر کا سے کہوں دُکھ جائے کر
سوزم فتادہ در تنم پیو دے گئے سلگائے کر

آں سیم تن گوید مرا در کوئے ما آئی چرا
ماہی صفت تڑپھوں پڑا جو ٹک نہ دیکھوں جائے کر

گشتم چوں جوگی در بدر یا بم اگر جائے خبر
پر پر رہیا بہوتوں نگر اجوں نا ملیا آئے کر

بسیار گفتم ایں سخن اے دل بگس رغبت مکن
اُن کی تباہی ات کٹھن بہوتوں کہے سمجھائے کر

بس حیلہ کردم اے حسن بے جاں شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن غم لے گئے سنگ لائے کر

....

کلام میں صوفیانہ رنگ اور سوز و گداز موجود ہے لیکن اُن کی شاعری امیر خسرو کے سامنے پھیکی پھیکی لگتی ہے۔

احمد نامی ایک شاعر غالباً خسرو کے زمانے کے ہیں، زیادہ تر مرثیہ کہتے تھے۔ اُن کا ایک شعر اِس طرح ہے:

گر طفلکے بازیگرے خوانندہ و عالم شود
اصلے کہ دارد کے رود آخر زنبورا ہوئے پر

....

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خسرو کی سطح سے کہیں نیچے کے شاعر تھے۔

خواجہ سید محمد الحسینی شہباز (۱۳۲۱ء ۔ ۱۴۲۲ء) بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہیں۔ عبادات کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ دیوان کے علاوہ بیشتر تصانیف فارسی میں ہیں۔ شمالی ہند میں اگرچہ نظم کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن دکن میں حضرت بندہ نواز ہی قدیم اُردو کے پہلے شاعر گردانے جائیں گے۔ اُن کی ایک ہندی غزل نما نظم ملتی ہے جس میں سے گھوڑے کے حوالے سے مختلف مضامینِ تصوف باندھے گئے ہیں جو گیت نما شاعرانہ مزاج کی حامل ہے۔ مقطع پیشِ خدمت ہے۔

شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ آپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توں

....

اِس غزل نما نظم کے اشعار بھی خسرو کے ریختہ سے آگے نہیں نکلتے۔

مولانا برہان الدین مظفر بلخی (۱۳۲۵ء ۔ ۱۴۰۱ء) ابو الفضل کے مطابق یحییٰ احمد منیری کے خلیفہ تھے۔ فارسی دیوان کی اطلاع ملتی ہے۔ ریختہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

بیچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے
بل بے ظالم تس اوپر ٹک دیکھنے کو ترساوے ہے

جب تی چھوڑس کھانا پینا تیرا دور نہ الفت میں
خونِ جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کو کھاوے ہے

یہ اشعار خسرو کے درج بالا ریختہ کے سامنے بہت سطحی محسوس ہوتے ہیں۔

تاج الدین فیروز شاہ بہمنی فیروزی (۱۳۷۱ء ۔ ۱۴۲۲ء) بہمنی سلطنت کے اکثر بادشاہوں کی طرح فیروز شاہ بہمنی بھی علم دوست اور شعر و سخن کے قدردان تھے۔ وہ اوائلِ عمر سے ہی ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے اور کارِ حکمرانی کے ساتھ رعایا کی علمی و اخلاقی بلندیِ معیار کے لیے کوشاں رہے۔

اُنھوں نے محمود شاہ بہمنی کے آغاز کردہ شعرو ادب کے عہد کو تسلسل فراہم کیا۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور فیروزی کے علاوہ عراجی بھی تخلص کرتے تھے۔

تج مکھ چندا جوت جلے سارا جیوں
تج کان یہ موتی جھمکے تارا جیوں

فیروزی عاشق کوں ٹک یک چاکن دے
تج شوخ اُدھر لب اہے شکر پارا جیوں

....

اُن کی شاعری کی سطح اِن دو اشعار سے بخوبی واضح ہوتی ہے جو خسرو کے مقابلہ میں کمتر ہے۔ امیر حسن سے کر فیروزی تک کے شعراُ کے ریختوں میں وہ جان اور قوت نظر نہیں آتی جو خسرو کے ریختہ میں ہے البتہ کبیر داس (۱۴۴۰ء-۱۵۱۸ء) ہندی کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کا کلام معنی آفرینی اور سوز و گداز سے لبریز ہے۔ اُن کی دائمی شہرت کا راز دقیق خیالات کا معمولی الفاظ کے ذریعے ہر خاص و عام کے قابل بنا دینا ہے۔ سچے صوفیوں اور عارفوں کی طرح معرفتِ الٰہی، دُنیا کی بے ثباتی، ریا اور ظاہرداری کے خلاف اُن کے کلام میں اعلیٰ درجے کے اشارے موجود ہیں جن میں سادگی اور شیرینی کے ساتھ اثر اور زور بھی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے یکساں کارگر رہے۔ کبیر نے ذاتی تجربے کی سچائی اور خلوص کو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کیا جس سے اُن کی شاعری میں معنویت کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی آئی۔ اُن سے منسوب ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دُنیا سے یاری کیا

جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو اِنتظاری کیا

نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے
اُنھیں سے نیہہ لاگی ہے ہمن کو بے قراری کیا

کبیرا عشق کا ماتا' دوئی کو دُور کر دِل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سر بوجھ بھاری کیا

....

کبیر داس کی زبان کھڑی بولی تھی بالخصوص اُن کے دوہرے کھڑی بولی میں ہیں:

آچھے دن پاچھے گئے گرو سے کیا نہ ہیت
اَب پچھتاوا کیا کرے چڑیاں چگ گئیں کھیت

دُنیا ایسی باوری پتھر پوجن جائے
گھر کی چکیا کوئی نہ پوجے جے کا پیسا کھائے

ماکھی گڑ میں گڑ رہی پنکھ رہیو لپٹائے
ہاتھ ملے اور سر دھنے لالچ بُری بلائے

....

ان کے دوہروں اور ریختہ کے اشعار کی زبان میں بہت فرق ہے اور دونوں تخلیقات ایک

زمانے کی معلوم نہیں ہوتیں۔ یوں بھی کبیر سے منسوب ہندوی اشعار کی سند مشتبہ ہے سو اُن کے دوہروں کو دیکھتے ہوئے ان کے محولا بالا ریختہ کے خالق ہونے میں تامل ہوتا ہے کیونکہ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس (۱۴۵۶ء۔ ۱۵۳۸ء)، جمال الدین جمالی کنبوہ دہلوی (۱۴۵۸ھ - ۱۵۳۶ء)، ملاّ نوری اعظم پوری (۱۴۷۷ء - ۱۵۵۶ء)، فدائی دکنی، گستاخ دکنی، مشتاق بیدری (زمانہ ۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) اور لطفی بیدری (ہم عصر مشتاق) کے ہاں یہ زبان ملتی ہے:

کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا
تج کارن تیں اپنا کیتا
(الکھ داس)

آں پری رُخسار چوں شانہ بہ چوٹی می کند
جاں درازِ عاشقاں را عمر چھوٹی می کند
(جمالی کنبوہ)

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے
(نوری)

یو تجہ نظر کا جو برق شمشیر کے دلاں کوں جو کتا کیا
سینے میں عاشق کے تیر ہو کر یو تجہ نین کا پلک رھیا ہے
(فدائی)

پیا کے دیکھنے کارن دو نیناں میں چراغاں دھر
مرمو کے بتیاں کر کر اجو روغن جلائی میں
(گستاخ)

تج کیس گھنگھر والے بادل پٹیاں ہیں کالے
تج ماتھ کے اُجالے بجلیاں اُٹھیاں گگن میں
(مشتاق)

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں
(لطفی)

اور کبیر سے منسوب غزل کی زبان ان سب سے ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے اور غالباً اسی لیے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ غزل بعد میں اُن سے منسوب کی گئی ہے کیونکہ زبان کی وہ صفائی جو کبیر کی غزل میں موجود ہے ان کے بعد آنے والے کئی شعرا مثلاً ولی اللہ شمس دکنی (زمانہ ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء)، حاجی پیر بہرام سقا بردوانی (م ۹۶۹ھ ۱۵۶۲ء)، شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجراتی (م ۱۵۶۵ء)، تلسی داس (۱۵۳۲ء - ۱۶۲۳ء)، نور الدین محمد ظہوری ترشیزی دکنی (۱۵۳۷ء - ۱۶۱۶ء) کی شاعری میں بھی نہیں پائی جاتی البتہ احمد گجراتی (۱۵۳۹ - قبل ۱۶۵۶ء) اور حسن شوقی (۱۵۴۱ء - ۱۶۳۳ء) وہ پہلے شاعر نظر آتے ہیں جنھیں زبان کی حد تک قبل کے عرصہ پر فوقیت حاصل ہے:

ہوئے دیدار کے طالب خُودی سے خُو گذر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں، خرد شاں بے خبر نکلے

گھنگھٹ جب زرزری کہ پرتے موہن دور کر نکلے
مقابل ہوئے نا ہرگز اگر سور سحر نکلے

رہے نادر خیالاں میں ملے شوریدہ حالاں میں
ہوئے صاحب کمالاں میں، کدھر آ کر کدھر نکلے

موہن کے غم سوں گل گل کر نین سوں رات دن میرے
کہ پانی ہو کے مجھ سارا کلیجہ ہور جگر نکلے

چنچل کی جب صفت لکھنے قلم میں ہاتھ تیں لیتا
یکا یک ہاتھ میں میرے قلم ہو نیشکر نکلے
(احمد گجراتی)

تجھ نین ماتا جو کوئی تس جام سیتی کام کیا
تجھ زلف کا کافر جنے اسلام سیتی کام کیا
تجھ زلف ہور رخسار کی سرخی سیاہی چک دیکھیا
مجھ صبح کے پروا نہیں ہور شام سیتی کام کیا
میں ننگ ہور ناموس کوں پاپوش کر کیتا وداع
اب ننگ سوں نسبت نہیں ہور نام سیتی کام کیا
انجام کی مقصود اگر آغاز میں حاصل ہوئی
مقصود کی آغاز کوں انجام سیتی کام کیا
شوقی خدا ہور مصطفےٰ شاہی گدائی تجھ دئیے
یہ دین دنیاں ہے جسے تس کام سیتی کام کیا
(حسن شوقی)

لیکن باطنی جذب و کیف میں یہ اشعار بھی خسرو کے اشعار کے مدمقابل نہیں لگتے۔ خسرو کے ریختہ کا سحر قلی قطب شاہ، غواصی بیجاپوری، پنڈت چندر بھان برہمن، معظم بیجاپوری، نصرتی بیجاپوری، عبداللہ قطب شاہ، قاضی محمود بحری، ہاشمی بیجاپوری کے بعد اس وقت قدرے کم ہوتا محسوس ہوتا ہے جب غالب کے ’’بحرِ بے کراں‘‘ اور اقبال کے ’’مرشد کامل‘‘ کے ناموں سے یاد کیے گئے بیدل عظیم آبادی (۱۶۴۴ء۔ ۱۷۲۰ء) کی یہ غزل مطلعِ شاعری پر ظہور کرتی ہے:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
موجوں کی زد میں آئی جب کشتیِ تعین
بحرِ فنا پکارا ساحل کہاں ہے ہم میں
خارج نے کی ہے پیدا تمثال آئینے میں
جو ہم سے ہے نمایاں داخل کہاں ہے ہم میں
سوزِ نہاں سے کب کا وہ خاک ہو چکا ہے
اب دل کو ڈھونڈتے ہو اب دل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پہ عشق آن کے پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

بیدل کا کلام اجتہاد اور جدت سے لبریز ہے۔ وہ اپنی پختگیِ اسلوب، شدتِ بیان اور ندرتِ احساس کی بدولت معانی تازہ تخلیق کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بیدل کی طرز نے ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنایا۔ وہ ایک گہری سوچ رکھنے والے صاحبِ حال شخص اور منفرد شاعر تھے جن کی وضع کی ہوئی ترکیبیں اختراع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ولی اورنگ آبادی (۱۶۶۷ء۔ ۱۷۲۰ء) سے قبل بیدل وہ واحد شاعر ہیں جنھیں غزل یا ریختہ کے میدان میں خسرو کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ گویا چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل تک (قریباً چار سو برس کے عرصہ پر) خسرو کا ریختہ چھایا رہا اور بیدل کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے شاعروں حتیٰ کہ ملک الشعرا کی بھی خسرو کے سامنے ایک نہ چلی۔

☆☆☆☆☆

ادب ادیب اور اسلام عظمی [1961] سے شروع ہونے والا ادبی سفرنامہ [قسط ایک]

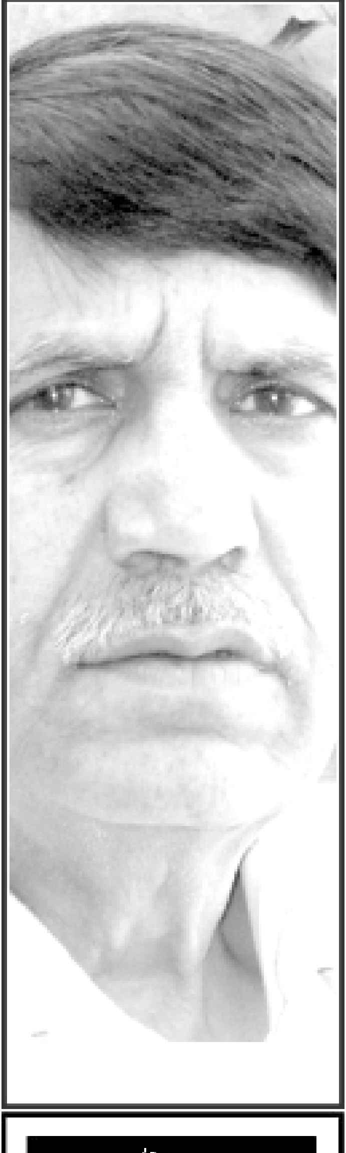

اسلام عظمی

میرا پہلا افسانہ 1961 میں گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور کے میگزین مطلع نو میں چھپا اور دوسرا گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے میگزین نخلستان ادب میں۔ اب مجھے اُن افسانوں کے نام یاد نہیں اور نہ ہی موضوعات کے بارے میں بہت یاد ہے۔ تاہم ایک افسانہ کالج کے باہر ایک بھیک مانگنے والی عورت کے بارے میں تھا۔ میں یہ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں افسانے افسانوی معیار پر پورے اُترتے تھے۔ میں فزکس، کیمسٹری، ریاضیات اور انگریزی کے اساتذہ سے ہی واقف تھا۔ اُردو کے اساتذہ تو مجھے نام سے بھی نہیں جانتے تھے۔ اُردو میں صرف مڈل سکول میں پڑھی ہوئی تھی۔ مجلہ نخلستان ادب کے مدیر اختر بزمی نے میرے افسانے کے چند الفاظ اس لیے حذف کر دیے کہ اُن الفاظ کی وجہ سے سعادت حسن منٹو پر فحاشی کا مقدمہ درج ہو گیا تھا۔ اُس دور کے سبھی نامی گرامی کہانی کاروں کی کتابوں سے میں گزر چکا تھا۔ تبھی سائنس کا طالب علم ہونے کے باوجود کہانیاں لکھ ڈالیں۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے میری کہانی میں اُن الفاظ کا در آنا اچھنبا نہ

تھا- بہاولپور میں نووارد ہونے کی وجہ سے میرے چند ایک دوست بنے- ڈگری لینے کے بعد مڑ کر بھی بہاولپور کی طرف نہیں دیکھا-

1961 میں کہانیوں کی لکھت اور اشاعت مسلسل رہی- غزلیں دو چار اور اشعار پندرہ بیس میری کل کائنات رہی- کوئی شعر پسند آجاتا تو ڈائری میں لکھ لیتا- پسندیدہ اشعار کی تعداد بھی بہت نہ تھی- یہ اشعار میرے دل کے قریب تھے- دل کا احوال دل والے ہی جانتے ہیں- دکھی رت میں کوئی حسب حال شعر نظر مل جائے تو بہت سہارا ملتا ہے- دکھ آپ ہی آپ اڑن چھو ہو جاتے ہیں-

کالج کے دنوں کے میرے پسندیدہ دیکھیں-

غم دوراں غم جاناں کی طرف یوں آیا
جانب شہر چلے دختر دہقان جیسے

اور

اپنے حالات میں ہر کوئی مقید ہے یہاں
اب ضرورت نہیں اس دور میں زندانوں کی

....

یہ دونوں شعر آج کے تناظر میں بھی تازہ ہیں- اور دونوں شعر جناب احمد ندیم قاسمی کے ہیں- دونوں شعر دو افسانوں کی طرح ہیں- انھیں پسند کرنا میرا طبعی طور پر کہانی کار ہونا ہے- دونوں شعروں میں غم دوراں اور غم جاناں کا تذکرہ رواجی بھی ہے اور سماجی بھی- عجیب دور تھا وہ یار-

احمد ندیم قاسمی کی نظم ''نیلا پتھر'' کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا-

فیض احمد فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' گلی گلی دھمالیں ڈال رہی تھی-

ساحر لدھیانوی کی نظم ''اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر'' کا محفل محفل چرچا تھا-

احمد فراز کی غزل ''اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں'' تو دل زدہ منڈے اور کڑیاں سرہانے تلے رکھ کر سوتے تھے-

تقسیم ہند کے اثرات نمایاں ہو جانے کے باوجود ادب منقسم نہیں ہوا تھا- سرحد کے دونوں طرف ایک جیسے مسائل تھے-

پریم چند کے افسانے دونوں طرف سماج کے جبر کا حوالہ تھے-

کرشن چندر بہت اِن تھا مگر موضوعات عام طور پر شہری زندگی سے متعلق-

راجندر سنگھ بیدی کہانی میں جزئیات کے ساتھ لے کر چلنے کے قائل تھے- احمد ندیم قاسمی کی پیدائش کا سال 1915 تھا تو راجندر سنگھ بیدی کا 1916- کہانی لکھنے کے سفر میں سڑک کے دونوں طرف کا احوال جو میں لکھ دیتا ہوں' یہ شاید راجندر

سنگھ بیدی کو بغور پڑھنے کا شاخسانہ ہے۔
2016 میں اپنے تیسرے افسانوی مجموعے ''اُڑنے والی چڑیا'' کا انتساب جہاں میں نے احمد ندیم قاسمی کے نام کیا، وہیں راجندر سنگھ بیدی کا تذکرہ کرنا بھی نہیں بھولا۔

میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی دیہی زندگی اور سماجی جبر کے عکاسی تھے۔ اُن کے کردار مافوق الفطرت نہیں، جیتے جاگتے انسان تھے۔ مظلومیت کا بیان اُن کا وتیرہ تھا۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں کی طرح احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو چھپ کر پڑھنا نہیں پڑھتا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کے افسانوی مجموعے ''شعلے'' کی اشاعت پر ہونے والا شوروغل ابھی تازہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی سے میرے لگاؤ کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کا تعلق بہاولپور کے صادق ایجرٹن کالج سے رہا تھا۔ لاہور آنے کے بعد میں کہانی لکھتا۔ ڈاک سے یا دستی کسی ادبی رسالے کے دفتر میں دے آتا۔ دو چار دفتری ساتھی اچھے ذوق کے مالک تھے۔ انھیں چھپی کہانی دکھا کر خوش ہو جاتا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ آٹھویں جماعت تک ہی اُردو کی تعلیم کی وجہ سے میرا اُردو الفاظ کا تلفظ خاصا کمزور رہا ہے۔ تلفظ کی کمزوری اور لغت نہ دیکھنے کی عادت بعض اوقات میرے شعر کو بے وزن کر دیتی ہے۔ اس کی میں کچھ خاص پروا بھی نہیں کرتا۔

1975 تک میرے افسانے کم وبیش سارے ادبی رسالوں (بشمول فنون) اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں چھپ چکے تھے۔ جنوں میں بھی میرا افسانہ شائع ہوا ہے، میں اس بات سے بے خبر تھا۔ یہ الگ کہانی ہے اور احمد ندیم قاسمی پر اپنے مضمون ''پہچان کا سفر'' میں کر چکا ہوں۔ یہ مضمون میرے ادبی مضامین کے مجموعے ''بے ساختہ'' میں چھپ چکا ہے۔ ایک دفتری ساتھی بار بار کسی حلقے میں شمولیت کے لیے اکساتا۔ میں جواب دیتا۔

ارے بھائی، لکھنا میرا شوق ہے۔ کہانی لکھتا ہوں۔ وہ چھپ جاتی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں۔ بالآخر وہ مجھے حلقہ اربابِ غالب میں کھینچ لایا۔ خالد احمد حلقہ اربابِ غالب کے روحِ رواں تھے۔ زمان کنجاہی سیکریٹری۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سیکریٹری شپ قائم نقوی کو مل گئی۔ خالد احمد کی شادی کے دن بھی دیال سنگھ لائبریری میں حلقے کا اجلاس ہو رہا تھا۔ بلکہ شاید مشاعرہ۔ خالد احمد بیچ میں سے وقت نکال کر مشاعرے میں آیا تو کسی نے کہا۔

خالد احمد آج گا کر سنائے گا۔ اس فرمائش پر لگائی جانے والی گرہ غیر مہذب ہے۔ حلقہ ارباب غالب اور حلقہ ارباب ذوق کے نام ایک ساتھ دیکھنے سے لگتا ہے۔ کہ ایک گروہ شاعر غالب کا ہے اور دوسرا شاعر ذوق کا۔ حلقوں کے ناموں کا موازنہ کرتے ہوئے ذہن بھٹک کر غالب کے مصرع ”بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا“ کی طرف چلا جاتا۔ تاثر کیا قائم ہوتا ہے یہ آپ خود سمجھ لیں۔

حلقے میں میں شفیق سلیمی اور ضیا نیر کے ساتھ آیا تھا۔ چار بندوں خالد احمد، نجیب احمد، قائم نقوی اور زمان کنجاہی سے فوری جان پہچان ہوگئی تھی۔ بہت سے دوستوں کا ذکر میں اپنے پہلے افسانوی مجموعے ”جوگ اور نجوگ“ میں کر چکا ہوں۔ ایک روز شفیق سلیمی مجھے فنون کے انارکلی والے دفتر میں لے گیا۔ فنون کے دفتر کو کچھ لوگ دربار کہتے تھے۔ میرے پہلے ادبی پراگے کے دوست شاہد شیدائی بھی دربار کہنے والوں میں شامل تھے۔ شاہد شیدائی اور حسین مجروح حبیب بنک میں تھے۔ انھوں نے اکٹھے پبلشنگ شروع کی۔ پھر کچھ اختلافات پیدا ہو گئی۔ میں نے حسین مجروح سے وجہ پوچھی تو حسین مجروح نے بتایا۔

”میں کہ بیٹھا تھا کہ ہم ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ بھی کوئی اور کتاب شائع کریں۔ نہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ ہم اُن کے مزارع ہیں۔“

یہ بات تو خیر ایسے ہی بیچ میں آ گئی۔ اللہ رب العزت دونوں کو سلامت رکھے۔ تعلقات میں بہر حال کوئی دراڑ نہیں آئی تھی۔ زندگی کا سفر ہے ہی ایسا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی مجبوری راستہ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہاں ایک شعر یاد آ گیا ہے۔ سن لیں۔ میرا پسندیدہ شعر ہے۔ شاعر کا نام بھول گیا ہوں۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

....

حلقہ ارباب غالب اور لاہور کی ادبی محفلوں سے میرا تعلق چار پانچ سال ہی رہا۔ میں امارات چلا گیا۔ جاتے ہوئے مجھے حلقہ ارباب غالب کے ایک اجلاس کی صدارت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ تب تک میرا جناب احمد ندیم قاسمی چند بار آمنا سامنا ضرور ہوا تھا مگر اسے کسی طرح بھی ملاقاتیں نہیں کہا جا سکتا۔ ملاقات ایک الگ معاملہ ہے۔ کالج کے دنوں میں دیوان سنگھ مفتون کی یادداشتوں کا مجموعہ ”ناقابل فراموش“ پڑھا تھا۔ اس میں وضع داری کے کئی بیان تھے۔ بعد ازاں جب احمد ندیم قاسمی سے کچھ

ملاقاتیں ہوئیں تو اُن کی شخصیت میں پرانی وضع داری کی خصوصیات بدرجہ اُتم محسوس کیں۔ اُن کی طرح میں بھی خود آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروانے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ کوئی کتنا بھی پہنچا ہوا کیوں نہ ہو' میں اُسے دیوتا ماننے سے انکاری رہا ہوں۔

(مرحوم) شفیق سلیمی میرا ادبی اے۔ٹی۔ایم ATM رہا ہے۔ کسی کے بارے میں کچھ جاننا ہوتا تو اُس سے پوچھ لیتا۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں بے تکلفانہ گفتگو کرتا تو مجھے رشک آتا۔ وہ مجھے کوئی پہنچا ہوا بندہ لگتا۔ آغاز میں نے احمد ندیم قاسمی کے دو شعر لکھے ہیں۔ امارات کے بعد میں نے وہاں کے طرحی مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی پہچان بھی بنا لی۔ جب اچھی خاصی غزلیں جمع ہو گئیں تو شعری مجموعہ چھاپنے کا سوچنا شروع کر دیا۔ چھٹی پر آنے کے بعد میں نے خالد احمد کو اپنے شعری مجموعہ کے لیے سکوت کا نام چننے کا بتایا اور ساتھ یہ بھی کہ میں نے یہ نام احمد ندیم قاسمی کے اس شعر سے اخذ کیا ہے:

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیم
میں نے سنا سکوت کو بھی بولتے ہوئے

....

خالد احمد نے مسکرا کر کہا۔
اسلام عظمی سکوت کے حوالے سے قاسمی صاحب کا یہ شعر زیادہ بلند ہے۔

ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکوت بھی صدا ہے

....

مگر 1997 میں جب میرا پہلا شعری مجموعہ چھپا تو اپنی غزل کے اس شعر نے رستہ روک لیا۔

بہت دن تک نہیں رہنا اڑانوں کا ہرا موسم
ہمیں تھک ہار کر مٹی ہی سے منسوب ہوتا ہے

اور میں نے مجموعے کا نام اڑانوں کا ہرا موسم طے کر لیا۔ خالد احمد کو بھی یہ نام پسند آیا۔ میں نے پوچھا "اسے چھاپے گا کون۔"

خالد احمد نے کچھ سوچا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ایبٹ روڈ کے اپنے دفتر سے نکل پڑا۔ خالد احمد ایبٹ روڈ سے پرانی انارکلی میں الحمد پبلشرز کے دفتر تک میرے ساتھ پیدل چلا۔ اور مجھے صفدر حسین کے سپرد کر دیا۔

ہائے خالد احمد---

یہ "ادب ادیب اور اسلام عظمی" کے سلسلے کی پہلی قسط ہے۔ ارادہ ہے کہ پاک و ہند کے جن لکھاریوں سے میرا مکالمہ ہوا وہ بلا کم و کاست بیان کر دوں۔ اور میں ایسا ان شاءاللہ کروں گا۔

☆☆☆☆☆

راشد عباسی کی کتاب ''جہانِ ابد''

طارق بٹ

راشد عباسی کی شاعری کا یہ مجموعہ ''جہانِ ابد'' اپنے اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ شاعر نے بجا طور پر اسے ''عام آدمی کے لیے نظمیں'' کہا ہے، کیونکہ یہ کلام براہِ راست اسی دل کی دھڑکن اور اسی روح کے اضطراب کو چھوتا ہے جو عام انسان کے اندر موجزن ہے۔

راشد عباسی کی کتاب ''جہانِ ابد'' کی نظمیں بظاہر سادہ اسلوب میں ہیں مگر اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔

ان نظموں میں ایک طرف دکھ، جبر اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کی صدا سنائی دیتی ہے تو دوسری جانب اُمید، روشنی اور خواب کی کرنیں جھلملاتی ہیں۔ کہیں ہجرت، تنہائی اور بے سمتی کا نوحہ ہے، اور کہیں آگہی، بیداری اور تعمیرِ نو کی پکار۔

''عہدِ زوال'' اور ''انکار'' جیسی نظموں میں ظلم و جبر کے اندھیروں کے خلاف مزاحمت کا جذبہ ہے، جبکہ ''کربِ فراقِ ذات'' اور ''ہم کہاں آ گئے'' میں فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ اور وجودی سوالات نمایاں ہیں۔

دوسری طرف ''عزمِ مصمم''، ''آگہی کے دیئے'' اور ''خواب'' روشنی، اُمید اور خواب کی صورت قاری کے دل میں نیا حوصلہ جگاتی ہیں۔

یہ نظمیں نہ صرف شاعر کی داخلی کیفیات کا بیان ہیں بلکہ عہدِ حاضر کی اجتماعی روح کی بھی آئینہ دار ہیں۔ راشد عباسی نے بڑی سادگی مگر بھرپور تاثیر کے ساتھ عام آدمی کے دکھ، سوال اور اُمید کو ایسے لفظوں میں ڈھالا ہے جو براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''جہانِ ابد'' درد اور روشنی کا حسین امتزاج ہے— جہاں زخم بھی ہیں اور مرہم بھی، جہاں سوال بھی ہیں اور خواب بھی۔

نظموں میں فرد اور معاشرے دونوں کا دکھ جھلکتا ہے۔ ''دردِ بے درماں'' اور ''کرب

فراقِ ذات" میں ذاتی دکھ کے ساتھ اجتماعی مایوسی بھی ہے۔ شاعر سوال کرتا ہے کہ ظلمت کب ختم ہوگی اور سحر کب نمودار ہوگی۔

"انکار" اور "جہانِ ابد" جیسی نظموں میں ظلم و جبر کے خلاف ایک مزاحمتی رویہ ملتا ہے۔ شاعر اندھیروں اور جابرانہ قوتوں کے مقابلے میں چراغ جلانے اور امید کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتا ہے۔

"اسرارِ حیات" اور "خدا محبت ہے" جیسی نظموں میں ایک صوفیانہ اور فکری رنگ نمایاں ہے۔ شاعر کائنات کے اسرار، وقت و مکاں کے معمہ، اور خدا کی صفتِ محبت پر غور کرتا ہے۔

راشد انسان دوستی اور اُمید کا شاعر ہے۔

"عزمِ مصمم" اور "عزمِ نو" میں امید اور تعمیرِ نو کا پیغام ہے۔ شاعر شکست کو عارضی اور فتح کو حتمی قرار دیتا ہے۔ یہ نظمیں عام آدمی کے خواب اور جدوجہد کی ترجمانی کرتی ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ راشد عباسی نے "جہانِ ابد" میں عام انسان کی اُس داخلی دنیا کو لفظوں میں ڈھالا ہے جس میں درد بھی ہے، سوال بھی، اور امید بھی۔

چند نظموں پر بات ہو جائے۔

"دردِ بے درماں"

یہ نظم دکھ اور ناامیدی کی گہری فضا سے شروع ہوتی ہے۔ شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ تاریکی کب ختم ہوگی اور صبح کب نمودار ہوگی۔ چراغِ فکر و نظر کے بجھنے کا استعارہ ذہنی اور فکری جمود کی علامت ہے۔ اس نظم میں اجتماعی کرب اور سحر کی آرزو دونوں کا حسین امتزاج ہے۔

"انکار"

یہ نظم مزاحمت اور جبر کے خلاف انسان کی آواز ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظلم کے حکمراں اگر چراغ بجھائیں بھی تو ہم اپنے لہو سے دیے جلائیں گے۔ یہاں روشنی سے عشق کی سزا قبول کرنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔ یہ نظم عام آدمی کے دل میں بغاوت اور حوصلے کی جھلک پیدا کرتی ہے۔

"عزمِ مصمم"

یہ نظم امید اور تعمیرِ نو کا استعارہ ہے۔ شاعر عہد کرتا ہے کہ وہ انسانیت کے درد کا درماں بنائے گا اور قلیل عمر سے صدیوں کا کام لے گا۔ "مسمار کر کے خود کو جہانِ نو بنانا" جدوجہد اور قربانی کی علامت ہے۔ اس نظم میں انقلابی اُمید کی روشن جھلک ہے۔

"جہانِ ابد"

یہی کتاب کا نام ہے اور یہ نظم سب سے زیادہ مؤثر معلوم ہوتی ہے۔ شاعر ظلمت کی یورش، خون میں لتھڑے خواب، اور نیزوں پر سجے سروں کا ذکر کرتا ہے، مگر ساتھ ہی یہ امید بھی دیتا ہے کہ اندھیری رات کتنی ہی طویل ہو آخرکار صبح ضرور طلوع ہوگی۔ یہ نظم

ظلم کے خلاف تسلسلِ مزاحمت اور اُمید کی حتمی فتح کا استعارہ ہے۔

''خدا محبت ہے''

یہ نظم صوفیانہ رنگ رکھتی ہے۔ خدا کو صرف جلال یا قہر کے بجائے محبت اور عطا کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ شاعر کا پیغام ہے کہ خدا سے رشتہ محبت کا ہونا چاہیے، اور یہی انسانی رشتوں کو بھی پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ یہ نظم قاری کو روحانی سکون اور قربت کا احساس دیتی ہے۔

''نفرتوں کی ولدل میں''

یہ نظم ہمارے عہد کے اجتماعی دکھوں کی عکاسی کرتی ہے۔ خوف، بے یقینی اور ملال کی کیفیت ہر طرف چھائی ہے۔ شاعر دعا کرتا ہے کہ خدائے رحیم اپنی کرم نوازی سے ان غموں کو دور کرے۔ یہ نظم اجتماعی اذیت اور خدا کی رحمت پر امید کی ایک پراثر مثال ہے۔

راشد عباسی کی یہ نظمیں عام قاری کے دل کے قریب ہیں۔ وہ دکھ کو بیان کرتے ہیں مگر اُمید کی شمع بھی روشن رکھتے ہیں۔ ان نظموں میں مزاحمت، محبت، دعا، عقیدت اور انسان دوستی ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ چند اور نظمیں دیکھتے ہیں

''عہدِ زوال''

یہ نظم ہمارے معاشرتی اور سیاسی زوال کی ترجمانی کرتی ہے۔ بولنے والوں کو خاموش کرا دیا گیا ہے، اہلِ صدق مٹی میں مل گئے، اور زہر گھولنے والے مسندوں پر براجمان ہیں۔ یہ ایک تلخ سماجی حقیقت کا نوحہ ہے۔

''ہم کہاں آ گئے''

یہ نظم وجودی سوال ہے۔ سفر ہے، خواب ہے، مگر فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ شاعر حیران ہے کہ ہم اپنی تلاش اور خوابوں کے بیچ بھٹک کر کہاں جا نکلے۔ اس نظم میں بے سمتی اور بے یقینی کا شدید احساس ہے۔

''کم نصیبی''

یہ ہجرت اور جڑوں سے کٹنے کی کیفیت ہے۔ شاعر اپنے گاؤں، درختوں اور جھرنوں کو یاد کرتا ہے مگر شہر کی زندگی میں دربدر ہے۔ یہ نظم دیہات کی یاد، اپنوں سے دوری اور روحانی محرومی کا نقشہ ہے۔

''انقلابِ زمانہ''

یہ نظم وقت کی بے رحم رفتار اور زندگی کی بے وفائی کا بیان ہے۔ پہلے وقت اشارہ کرتا تو زندگی جھک جاتی، مگر اب وقت ہمیں بھلا دیتا ہے۔ یہ تبدیلی انسانی بے بسی اور تغیر کے کرب کو ظاہر کرتی ہے۔

''انتباہ''

یہ انتباہ ہے کہ اگر سچی آوازوں کو دبایا گیا تو انسان اپنے دل کی دھڑکن اور سناٹوں کے شور سے بھی ڈرنے لگے گا۔ یہ نظم آزادیِ فکر اور اظہار کی اہمیت اجاگر کرتی ہے۔

''مستعفی''

یہ نظم طنزیہ اور انقلابی ہے۔ شاعر عشق سے

استعفیٰ دیتا ہے، جیسے عشق ایک نوکری ہو گئی ہو۔ اس میں رومانوی نہیں بل کہ وجودی اور تلخ تجربے کا اظہار ہے۔

"اور تعبیر کیا"

یہ ایک بھرپور کرب اور ناامیدی کی تصویر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تعبیر بس رائیگانی ہے۔ ظلم، جبر، دائمی رات اور بے بسی کا ذکر ہے۔ یہ نظم سب سے زیادہ یاسیت اور شکستگی کا احساس دیتی ہے۔

"آگہی کے دیے"

یہ نظم امید کا پیغام ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی مختصر ہے، لیکن ہمیں آگہی کے دیے جلانے ہیں تاکہ ہر کسی کو روشنی مل سکے۔ یہ فکری بیداری اور اجتماعی ذمہ داری کی نظم ہے۔

"وصیت"

یہ بہت طاقتور نظم ہے۔ بجھتے چراغ کی وصیت ہے کہ شبِ سیاہ کی بیعت نہ کرنا، اور روشن دیوں کو بجھنے نہ دینا۔ یہ مزاحمتی اور عزم سے بھرپور پیغام ہے، جو قاری کے دل میں ہمت جگاتا ہے۔

"تفسیرِ حیات"

یہ فلسفیانہ نظم ہے۔ شاعر کہتا ہے زندگی ایک ادق مضمون ہے جسے عقل نہیں سمجھ سکتی۔ کیا زندگی کی تفسیر ممکن ہے؟ یہ سوالی انداز نظم کو گہرائی بخشتا ہے۔

"خواب"

یہ نظم خوابوں کی عظمت اور ان کی معنویت پر ہے۔ خواب ہی عمر کا سرمایہ ہیں — معرفت کے، سحر کے، آزادی کے اور محبت کے خواب۔ یہ نظم مجموعے کی سب سے زیادہ پرامید اور مثبت نظموں میں سے ہے۔

"مختصر نظمیں"

یہ چھوٹی چھوٹی جھلکیاں بڑے کرب اور حقیقت کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک میں امید ہے کہ اپنے ہاتھ اپنے ساتھ ہیں، مگر اگلی میں زر پرستی اور روح کی موت کا ذکر ہے۔ یہ مختصر نظمیں قاری پر بجلی کی طرح گرتی ہیں اور فوری اثر چھوڑتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہوں گا کہ راشد عباسی کی شاعری میں تین بنیادی دھارے نمایاں ہیں:

سماجی و سیاسی شعور (عہد زوال، انکار، وصیت، اور تعبیر کیا؟)

وجودی اور ذاتی کرب (کربِ فراقِ ذات، ہم کہاں آ گئے، کم نصیبی)

امید، روشنی اور خواب (عزم مصمم، جہان ابد، آگہی کے دیے، خواب)

یہ نظمیں عام آدمی کے دکھوں اور خوابوں کا سچا بیان ہیں۔ ان میں کرب بھی ہے، سوال بھی، مگر روشنی اور امید بھی موجود ہے۔ شاعر کا انداز سادہ ہے مگر اثر آفریں ہے۔

☆☆☆☆☆

خالق آرزو کا عکسِ شہرِ آرزو

نسیمِ سحر

خالق آرزو نئی اور تازہ دم نسل سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے مسلسل شعری و نثری اظہار کے ساتھ ادبی دنیا کو فیضیاب کر رہے ہیں۔ ان سے میرا تعلق کافی عرصے سے ہے اور ان کی پہلی کتاب ''پلکیں بھیگنے لگتی ہیں'' پر اسلام آباد کی تقریبِ رونمائی میں بھی مجھے شرف شمولیت حاصل ہوا تھا۔ لیکن حال ہی میں ان کا تخلیقی سفر ماضی قریب سے کچھ زیادہ وسعت پذیری اور پھیلاؤ اختیار کرنے کے علاوہ جدید طرزِ اظہار کا بھی نمائندہ بن گیا ہے جس کا کچھ اندازہ مجھے ان کے نام خالق آرزو سے مربوط اس شعری مجموعے ''عکسِ شہرِ آرزو'' کا مطالعہ کرنے سے ہوا۔

معروف ادارے حسنِ ادب، فیصل آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا ۲۰۸ صفحات پر مشتمل یہ قدرے ضخیم مجموعہ ان کی نعتوں، غزلوں، نظموں، مناقب، قطعات اور ہائیکو پر مشتمل ہے اور خالق آرزو کی تخلیقی ہمہ رنگی کے ساتھ ساتھ فنی دسترس کا بھی نمایاں اظہار کر رہا ہے۔ عام شعری مجموعوں کے برعکس اس میں حمد و نعت سمیت تقریباً چودہ تقدیسی منظومات شامل ہیں، اس کا سبب خالق آرزو کا مذہبی رجحان بھی ہے جس کے تحت وہ کچھ عرصہ قبل بہت سے شعرا کے نعتیہ کلام کا انتخاب ''نعت میرا انتخاب'' کے عنوان سے شائع کر چکے ہیں۔ اسی تقدیسی رجحان کا عکس ان کے اپنے تخلیقی سفر پر بڑا واضح نظر آتا ہے کہ عکسِ شہر آرزو میں چودہ تقدیسی منظومات کے علاوہ بھی ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات کے بے شمار اشعار میں بھی حمدیہ و نعتیہ رنگ جھلک

رہے ہیں۔

ان کی غزلوں کا معتد بہ حصہ مختصر بحور پر ایسی خوب صورت شاعری پر مشتمل ہے جسے سہلِ ممتنع کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کے ابلاغ اور قاری تک ترسیل میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل کی مشکل پسندی اور ادق و ثقیل لفظی تراکیب یا الجھے ہوئے مضامین کی نسبت ایسی شاعری ہی ''از دل ریزد، بر دل خیزد'' کا مرتبہ حاصل کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ ہونے اور سینئر شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے سبب انہوں نے اپنی غزلوں میں کچھ مختصر یا طویل ردیفیں بھی استعمال کر کے نئے مضامین و موضوعات میں اظہار کیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنے پیش لفظ میں بہت ہی فکر انگیز بات کی ہے جس کا ایک اقتباس ان کا فلسفۂ شعری دکھانے کے لیے پیش خدمت ہے:

''الفاظ شاعری ہیں یا اُن کے ذریعے بیان کیے گئے دکھ سکھ، یا ان سب سے ادھر وہ خام احساس جس کا جیتی جاگتی زندگی سے کوئی رشتہ ہی بنتا ہو، ورنہ کیسے ایک شاندار نظم یا غزل کاغذ سے نکل کر آپ سے کلام ہی نہیں کر پاتی اور کیسے ڈھیلے ڈھالے کرافٹ کے سیدھے سادے سے مصرعے جی سے جڑ جاتے ہیں؟۔۔۔''

ان کی شاعری پر سید ریاض حسین زیدی اور جناب اکرم کنجاہی جیسے سینئر اور ادبی معیارات و رجحانات پر گہری تنقیدی نظر رکھنے والے نقادانِ فن نے دیباچوں میں رائے دیتے ہوئے ان کے تخلیقی سفر کے ارتقا کا اعتراف کیا ہے جبکہ ڈاکٹر نوید عاجز نے اپنے مختصر فلیپ میں بھی جامع انداز میں ان کی تخلیق کاری کا احاطہ کیا ہے۔ لیکن ان اہلِ علم و ادب کی آرا سے پہلے ان کے کچھ منتخب اشعار کے ذریعے راقم السطور اپنی رائے پیش کرنا چاہتا ہے۔ پہلے ان کے تقدیسی رنگ ملاحظہ ہوں جو نعوت و مناقب کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی جا بجا اجاگر ہو رہے ہیں:

میرے قلم کو جس نے عطا کی ہے روشنی
اس نائب و حبیبِ خدا کو مرا سلام

دشمنِ جان سے بھی پیار کرو
یہ سبق بس حضور دیتے ہیں

میں ان ہواؤں میں، گلیوں میں دھول بن کے اڑوں
اور اس دیار میں پھر ان کے نقشِ پا دیکھوں

اک طرف اپنے مدینے کو بچانا ہے مجھے
کیا کروں، ایک طرف کرب و بلا کھینچتی ہے

آرزو تکیہ ہمیں رب پر ہے
خالق شمس و قمر پر سوچیں

....

ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف سہلِ ممتنع ہے، اس رنگ میں ان کے بہت سے شعروں میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

سرحدِ حسن و عشق میں سمجھو
ایک محتاط فاصلہ ہوں میں

اپنے اندر ہمیں ہی ہمیں پاؤ گے
ہو جو فرصت ، کبھی آئنہ دیکھنا

میری پسپائی نہیں ہے مرے لہجے کی تھکن
حوصلہ میں نے زمانے، ابھی ہارا ہے کہاں

کون سا طرزِ عمل باقی ہے
سوچ کر ایسی ڈگر پر سوچیں

شکستہ ہوں مگر گرنے سے پہلے
سہارے آزمانا چاہتا ہوں

خود سے خود تک پہنچ نہیں پاتا
کون ہے درمیاں ، نہیں معلوم

خالق آرزو نے کچھ نئی ردیفوں سے اپنی غزلوں کو عمدہ جمالیاتی اور تخلیقی انداز میں سجایا ہے، یہ چند ردیفیں ملاحظہ ہوں: : کو مرا سلام، اور ہوتی ہے، نہ ہونے دینا، چلتا بن، درد کا ہے، ہمیں معلوم نہ تھا، پھر بھی ہے، کیا جانا چاہیے، شہرت کی خاطر بیچ دی، تیرا بھی ہے میرا بھی، پر ہنس رہا ہے۔ ان رواں اور سہل شعری ردیفوں میں سے چند ردیفوں میں ان کے خوب صورت شعر دیکھیے:

اگرچہ گھر میں فاقے ہوں مگر سائل کو کھانا دیں
نبیؐ کی آل کی شانِ سخاوت اَور ہوتی ہے

تم لاکھ ٹوٹ جانا پر ہجر کی شبوں میں
میلی رفاقتوں کی چادر نہ ہونے دینا

ہو گا روشن مرا بھی مستقبل
میرے ماضی و حال ، چلتا بن

ہم نے سوچا خیال درد کا ہے
ان کو شاید ملال درد کا ہے

زندگی چین سے ہوتی تھی بسر اے لوگو
ہم کبھی آ دھریں گے، ہمیں معلوم نہ تھا

جسم پر پیرہن تو ہے ، لیکن
آدمی بے لباس پھر بھی ہے

زندگی بھر حرف لکھے خون سے
شاعری شہرت کی خاطر بیچ دی

خالق آرزو کی نظم کوئی اپنی جگہ ایک الگ مضمون کی متقاضی ہے، ان کی کچھ بہت عمدہ نظموں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان، بے نظیر شہید، اور راحت اندوری کی یاد میں نظموں کے علاوہ وطنِ عزیز کے حوالے سے ملی نظمیں بھی شامل ہیں جبکہ کچھ نظمیں جمالیاتی و رومانی مزاج لیے ہوئے ہیں۔ چند نظمیں موضوعاتی بھی ہیں - انھوں نے اپنی نظموں میں اردو کے (مرحوم) شعرا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کچھ ہم عصروں اور سینئر شعرا کی شان میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ پوری کتاب میں صرف تین ہائیکو شامل ہیں جبکہ خالق آرزو کا تخلیقی وفور ان تین مصرعی نظموں میں عمدہ اظہار پر دسترس رکھتا ہے۔

یہ اظہاریہ خالق آرزو کے تخلیقی وفور اور شعری سفر پر چند معروف شعرا اور نقادانِ فن کے دیباچوں سے مختصر اقتباسات پر تمام کیا جا رہا ہے:

☆ ’’مجھے خالق آرزو کو دیکھ کر بڑا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں اپنے نام خلاق کی صفتِ عالیہ یعنی تخلیق کے جوہر نکھارنے میں بھی منہمک نظر آتا ہے وہاں دوسروں کی تخلیقات کو شہرت یافتہ بنانے کی تحاریک میں بھی پیش پیش رہتا ہے‘‘۔
(سیّد ریاض حسین زیدی)

☆ ’’آرزو کے کلام کا ایک وصف یہ ہے کہ ان کی غزل کی طرح ان کی نظم میں بھی ان کی پوری شخصیت جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ چاہے ان کے خارجی مشاہدات ہی کیوں نہ ہوں وہ ان کو اپنے اوپر طاری کر کے انھیں شدت سے محسوس کرتے ہیں اور ایک طرح سے جگ بیتی کو بھی ہڈ بیتی بنا دیتے ہیں۔ ان کا طرزِ اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔ انھوں نے رائج الوقت استعارات، علائم اور تشبیہات استعمال کی ہیں۔ (اکرم کنجاہی)

☆ ’’ان کا مجموعہ غزل و نظم اور شخصی مناقب سے آراستہ ہے، غزل کے موضوعات زندگی کے متنوع رنگوں کے ترجمان ہیں جبکہ شعری اسلوب روایت سے جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے نظم میں عصری آشوب کو سمونے کی عمدہ کاوش کی ہے‘‘۔
(ڈاکٹر نوید عاجز)

خالق آرزو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی تخلیقی زرخیزی نے درجِ بالا نقادانِ فن سے دادو تحسین حاصل کی ہے، مجھے ان کی مسلسل شعری و تخلیقی ریاضت دیکھتے ہوئے یقین ہے کہ وہ کائنات ادب میں بہت جلد اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ وماعلینا اِلاّ البلاغ۔

☆☆☆☆☆

مبارک شاہ کے ایک شعر کا ادراکی تنقیدی جائزہ

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

....

مبارک شاہ کا یہ شعر اپنی معنویت اور فکری گہرائی کے باعث محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ انسانی ادراک، تہذیبی شعور اور مابعد الطبعیاتی تجربے کی جھلک پیش کرتا ہے۔ ادراکی تنقیدی تھیوری (Perceptionism) کے تحت جب اس شعر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعر قاری کو ایک ایسے تجربے سے گزار رہا ہے جو اس کے شعور، رویے اور فکری ساخت پر براہِ راست اثرانداز ہوتا ہے۔ شاعر کا تہذیبی و تمدنی ادراک اس بات پر مبنی ہے کہ انسان کسی خاص طبقے، نسل یا مذہب تک محدود نہیں، بل کہ یہ پوری کائنات میں الوہی وجود کا مظہر ہے۔ اس ادراک کی جڑیں صوفیانہ روایت، اسلامی فکر اور انسانی مساوات کے فلسفے میں پیوست ہیں، لیکن شاعر نے اس تجربے کو محض تقلیدی یا وعظی انداز میں نہیں بل کہ تخلیقی کارگاہ میں نئے پیرائے کے ساتھ برتا ہے۔ سماجی سطح پر یہ شعر اس وقت کی معاشرتی صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے جہاں انسان کو اس کی حیثیت، دولت، طاقت یا طبقے کے پیمانے سے پرکھا جاتا ہے اور تحقیر و استحصال کا شکار کیا جاتا ہے۔ شاعر اس رائج معاشرتی رویے کو چیلنج کرتا ہے اور قاری کے ادراک کو جھنجھوڑ کر ایک نیا تناظر عطا کرتا ہے، جس میں ہر انسان کی عزت دراصل خدا کی عزت کے مترادف ٹھہرتی ہے۔

نظریاتی سطح پر مبارک شاہ خدا کی عظمت اور تقدس پر ایمان کے تناظر میں ایک ایسے انسانی تصور کو سامنے لاتے ہیں جو نہ صرف مساوات اور تکریم انسانیت کا قائل ہے بل کہ کائنات کے مابعد الطبعیاتی ڈھانچے کو بھی احسن تقویم کی صورت میں دیکھتا ہے۔ شاعر کی تخلیقی کارگاہ میں یہ شعر ایک ایسے فکری و جمالیاتی عمل کا نتیجہ ہے جس میں مشاہدہ، وجدان اور روحانی تجربہ یکجا ہو جاتے ہیں۔ شاعر نے انسانی وجود کو ایک ایسے

فرحت عباس شاہ

پردے کے طور پر پیش کیا ہے جس میں الوہی حقیقت اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہی تصور اس شعر کے مابعد الطبیعیاتی اسٹرکچر کو تشکیل دیتا ہے کہ کائنات کی بنیاد انسان اور خدا کے باہمی ربط پر قائم ہے، اور انسان کی توہین دراصل اس بنیادی ربط کی نفی ہے۔ یوں یہ شعر قاری کو محض ایک جملہ سکھاتا نہیں بل کہ اسے ایک ادراکی تجربے سے گزار کر یہ احساس دلاتا ہے کہ اس کی روزمرہ زندگی میں دوسروں کے ساتھ اختیار کردہ رویے دراصل اس کی اپنی روحانی اور فکری تقدیر کو متعین کرتے ہیں۔ ادراکی تنقیدی تھیوری کے تحت تصور خدا کے ادراک کی روشنی میں قاری کی بصارت اس شعر میں جمالیاتی و اخلاقی دونوں تجربات کو ایک ساتھ دریافت کرتی ہے، اور یہ دریافت اسے اپنی اجتماعی، سماجی اور انفرادی ذمہ داریوں پر نظرثانی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس طرح مبارک شاہ کا یہ شعر خدا کے ادراک، تہذیبی، تمدنی اور مابعد الطبیعیاتی سطحوں پر انسانی شعور کو وسعت دیتا ہے اور قاری میں ایک نیا زاویہ تشکیل دیتا ہے۔

ادراکی تنقیدی نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ قاری کی بصارت اور شعور کلام کو محض الفاظ کی سطح پر نہیں بل کہ اپنی ادراکی جہتوں کے ساتھ سمجھتا ہے۔ قاری جب اس شعر کو پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں کئی پرتیں کھلتی ہیں، اور ہر پرت قاری کے اپنے مشاہدے، تجربے اور اخلاقی احساس سے جڑ جاتی ہے۔ درج ذیل میں چند پہلوؤں کی وضاحت پیش کرتا ہوں۔

1۔ ادراکی تناظر میں انسان کی حرمت

یہاں شاعر قاری کو یہ ادراک کراتا ہے کہ انسان کے کسی بھی روپ ---- چاہے وہ کمزور ہو، فقیر ہو، بیمار ہو یا گناہ گار--- کی تحقیر دراصل انسانیت کی توہین ہے۔ قاری کا ذہن فوری طور پر انسانی برابری اور وقار کے تصور کو دریافت کرتا ہے۔

2۔ خدا کا تصور بطور بدلتا روپ

ادراکی تنقید کے تحت، یہ مصرعہ قاری کے ذہن میں ایک فکری جھٹکا پیدا کرتا ہے کہ خدا بھیس بدل کر دنیا میں آتا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جو قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر شخص کو ممکنہ طور پر الوہی تجلی کا مظہر سمجھے۔ اس ادراک کے ذریعے انسان کا رویہ بدل سکتا ہے اور تحقیر کی جگہ عزت و احترام کی سوچ ابھر سکتی ہے۔

3 - ادرکی تنقیدی تھیوری (Perceptionism) کے تحت قاری کا عملی ردعمل

اس شعر کو پڑھ کر قاری کا شعور متحرک ہوتا ہے کہ اس کی روزمرہ زندگی میں وہ دوسروں کے ساتھ کس رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ Perceptionism کا مقصد یہی ہے کہ فن پارہ قاری کے ذہن میں صرف جمالیاتی کیفیت نہ پیدا کرے بل کہ اس کے شعور اور

عمل پر بھی اثر انداز ہو۔ یوں شعر قاری کو اخلاقی اور انسانی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔

4- ادراک کی وسعت اور کثیر التفسیریت
(تصورِ خدا سے تصورِ انسان تک)

شعر ہٰذا قاری کو مختلف ادراکی سطحوں پر پہنچاتا ہے: مذہبی، اخلاقی، صوفیانہ اور انسانی۔ صوفیانہ زاویے سے دیکھا جائے تو ہر انسان میں خدا کی جھلک ہے؛ اخلاقی زاویے سے یہ نصیحت ہے کہ کسی کی توہین نہ کرو، جبکہ ادراکی زاویے سے یہ ایک فکری دعوت ہے کہ قاری اپنی perception کو وسعت دے اور انسان میں پوشیدہ الوہی امکانات کو پہچانے۔ میں اس شعر کو تصوف کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اردو شاعری کی صوفیانہ روایت کا ایک ایسا شاہکار قرار دیتا ہوں جو ایک طرف بیک وقت تصورِ خدا اور تصورِ انسان کو تصوف کے ''میں ناہی سب توں'' نظریے کا عکاس ہے۔ مزید یہ کہ شعر نہ صرف اخلاقی تعلیم دیتا ہے بل کہ انسان کے وجودی اور مابعد الطبعیاتی مقام کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہ شعر اپنے اندر ایک گہرا فلسفہ سموئے ہوئے ہے جو انسان کی تکریم، خدا کے تصور اور کائنات کے ساتھ انسانی تعلق کو نئے زاویوں سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ادراکی تنقید (Perception Criticism) کے تحت دیکھا جائے تو یہ شعر قاری کے ذہن میں ایک ایسا شعور بیدار کرتا ہے جو نہ صرف اس کی انفرادی زندگی بل کہ اس کے اجتماعی رویّے کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔

شعر کا پہلا مصرع، ''آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا'' ہی اپنے اندر ایک مکمل فکر لیے ہوئے ہے۔ ''آدم'' سے مراد صرف ایک فرد نہیں بل کہ پوری انسانیت ہے۔ ''روپ'' سے مراد ظاہری شکل و صورت، سماجی حیثیت، مذہبی وابستگی، معاشی حالت یا کوئی اور خارجی خصوصیت ہے۔ ''تحقیر نہ کرنا'' ایک اخلاقی ہدایت ہے جو انسان کو کسی بھی صورت میں دوسرے انسان کی توہین سے روکتی ہے۔ جبکہ دوسرا مصرع، ''پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر'' پہلے مصرع کی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ ''خدا بھیس بدل کر'' ایک استعارہ ہے جو خدا کے حاضر و ناظر ہونے، اس کے ہر شے میں موجود ہونے اور انسان کی صورت میں ظاہر ہونے کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ ''زمانے میں پھرنا'' سے مراد کائناتی حرکت اور خدا کے تجلیات کا تسلسل ہے۔

ادراکی تنقید کا بنیادی نکتہ جہاں تخلیق کار کی کارگاہِ تخلیق اور تخلیقی عمل کی ماہیت تک رسائی کی کوشش ہے وہاں یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ ادب قاری کے شعور، رویوں اور نفسیات کو

کیسے متاثر کرتا ہے۔ مبارک شاہ کا یہ شعر قاری کے ادراک کو تین سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔

(الف) اخلاقی ادراک کی تبدیلی

شعر پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے: ''کیا میں نے کسی کو اس کی ظاہری حالت کی بنیاد پر کمتر سمجھا ہے؟'' یہ سوال قاری کے اخلاقی شعور کو جھنجھوڑتا ہے اور اسے اپنے رویوں پر نظرِ ثانی پر مجبور کرتا ہے۔

(ب) مابعد الطبیعیاتی ادراک کی تشکیل

شعر قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ خدا محض آسمانوں پر نہیں بل کہ زمین پر ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ تصور قاری کے خدا کے ساتھ تعلق کو تبدیل کرتا ہے اور اسے ہر انسان میں خدا کی تجلی دیکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔

(ج) سماجی ادراک کی تعمیر

شعر سماجی عدم مساوات، تعصب اور تفریق کے خلاف ایک زبردست تنقید پیش کرتا ہے۔ قاری اس شعر کے بعد سماج میں پائے جانے والے طبقاتی نظام اور نسلی تعصب پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مبارک شاہ کے تصورِ خدا کو سمجھنے کے لیے ان کے دیگر اشعار اور تاریخی تناظر میں ان کی فکر کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

میرے نزدیک مبارک شاہ ایک صوفی شاعر ہیں جن کا تعلق جنوبی ایشیا کی صوفیانہ روایت سے ہے۔ ان کا تصورِ خدا وحدت الوجودی (Pantheistic) ہے، یعنی خدا کو ہر شے میں موجود ماننا۔ یہ تصور ابن عربی، رومی اور دیگر صوفیا کی فکر سے متاثر ہے۔

مبارک شاہ کے نزدیک خدا محض ایک علی و برتر وجود نہیں بل کہ وہ ہر انسان میں موجود ہے۔ وہ خدا کو ''بھیس بدل کر'' پھرتا ہوا دیکھتے ہیں، جو درج ذیل نکات کی عکاسی کرتا ہے۔

1- خدا کی قربت

خدا انسان سے دور نہیں بل کہ قریب ہے اور اسے ہر انسان کے روپ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خدا کی تجلی: خدا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور انسان ان تجلیات کو پہچان سکتا ہے۔

2- انسان کی عظمت

انسان محض مادی وجود نہیں بل کہ خدا کا مظہر ہے، اس لیے اس کی توہین در اصل خدا کی توہین ہے۔

3- صوفیانہ اور فلسفیانہ پس منظر

مبارک شاہ کا یہ شعر صوفیانہ ادب کے اہم موضوعات میں سے ایک کو پیش کرتا ہے

''خدا کا انسان میں ظہور''۔ یہ موضوع وحدت الوجود کے فلسفے سے جڑا ہوا ہے، جس کے مطابق خدا اور مخلوق میں کوئی separation نہیں بل کہ خدا ہر شے میں موجود ہے۔ ابن عربی نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں لکھا ہے، ''خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا''، جو اس شعر کی اساس بنتی ہے۔

اسی طرح، مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے،

"گشتے بر در ما ایں ہم چنیں، تا چندی جان ما را در زمین"
(خدا ہمارے دروازے پر اسی طرح گھومتا ہے تاکہ وہ ہماری روح کو زمین میں باندھے)۔
مبارک شاہ کا شعر اسی روایت کا حصہ ہے جو خدا کے انسان میں حلول (Incarnation) کے بجائے تجلی (Manifestation) کے تصور پر زور دیتا ہے۔

4- سماجی اور تہذیبی تناظر میں شعر کی معنویت

مبارک شاہ کا یہ شعر آج کے دور میں بھی اپنی relevancy برقرار رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں نسلی تعصب، مذہبی انتہا پسندی، معاشی inequality اور سماجی stratification نے انسانوں کے درمیان تفریق کو بڑھاوا دیا ہے۔ یہ شعر ان تمام تر تقسیموں کے خلاف ایک آواز ہے۔

5- نسلی تعصب کی مخالفت

شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کسی کو اس کی رنگت، نسل یا قومیت کی بنیاد پر کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔

6- مذہبی رواداری

شعر یہ تعلیم دیتا ہے کہ خدا کسی خاص مذہب یا فرقے تک محدود نہیں بل کہ ہر انسان میں موجود ہے۔

7- معاشی مساوات

امیر اور غریب کی تفریق کو ختم کرتا ہے، کیونکہ خدا کسی بھی روپ میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

8- عالمی ادب اور فلسفیانہ تصورات

مبارک شاہ کا خدا اور انسان کا یہ تصور صرف اسلامی صوفیانہ روایت تک محدود نہیں بل کہ دنیا کے دیگر مذاہب اور فلسفوں میں بھی پایا جاتا ہے۔
بھگوت گیتا میں کرشنا کہتے ہیں، "جو مجھے ہر چیز میں برابر دیکھتا ہے، وہ نہ کبھی مجھ سے جدا ہوتا ہے نہ میں اس سے"۔
بدھ مت نے تعلیم دی کہ ہر انسان میں بدھ کی فطرت (nature-Buddha) موجود ہے۔
بائبل میں ہے، "جو تم نے ان غریبوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا، تم نے وہ میرے ہی ساتھ کیا" (متی 40:25)۔
یونانی فلسفے میں افلاطون نے ofIdea Good کے ذریعے یہی بات کہی کہ حقیقت ہر شے میں موجود ہے۔

9- نفسیاتی اور وجودیاتی پہلو

شعر کے نفسیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو یہ انسان کے خودی (Self) اور دوسرے (Other) کے درمیان تعلق کو نئی شکل دیتا ہے۔ کارل گستاف یونگ کے مطابق، انسان کا نفسیاتی عمل اسے دوسروں کے ساتھ تعامل میں مدد دیتا ہے۔ اگر انسان دوسرے کو خدا کا مظہر سمجھے تو اس کا رویہ مثبت ہو جاتا ہے۔
وجودیاتی (Existential) لحاظ سے یہ شعر انسان کی اپنی existence کو معنویت عطا کرتا ہے۔ ژاں پال سارتر کا کہنا

تھا کہ انسان اپنے actions سے خود کو define کرتا ہے- مبارک شاہ کا شعر انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس کے actions دراصل خدا کے ساتھ اس کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں-

10- جدید دور میں شعر کی relevancy

آج کے دور میں جب سماجی میڈیا نے انسانوں کے درمیان virtual divisions پیدا کر دی ہیں، یہ شعر ایک اہم پیغام دیتا ہے- online bullying، hate speech اور تعصب کے خلاف یہ شعر ایک weapon کی طرح استعمال ہو سکتا ہے- اس شعر کو سوشل میڈیا پر trending کیا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل تک ایک طاقتور مثبت اور تعمیری پیغام پہنچے-

11- تعلیمی اور تربیتی نقطہ نظر

تعلیمی اداروں میں اس شعر کو اخلاقی تعلیم کے طور پر پڑھایا جا سکتا ہے- طلباء کو یہ سکھایا جا سکتا ہے کہ ہر انسان قابل احترام ہے اور اسے اس کی خارجی حالت کی بنیاد پر پرکھنا غلط ہے- اس شعر کے ذریعے طلباء میں empathy اور tolerance جیسے جذبات پروان چڑھائے جا سکتے ہیں-

12- شعر کی عالمگیریت اور ابدیت

مبارک شاہ کا یہ شعر اپنی سادگی میں ایک گہرا فلسفہ سموئے ہوئے ہے- یہ نہ صرف صوفیانہ فکر کی عکاسی کرتا ہے بل کہ انسانی حقوق، مساوات اور احترام آدمیت کا ایک عالمی منشور بھی ہے- اس شعر کا پیغام timeless ہے، یعنی ہر دور میں اس کی relevancy برقرار رہے گی- یہ شعر ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ خدا ہر انسان میں موجود ہے، اس لیے ہر انسان کی تکریم دراصل خدا کی تکریم ہے-

مبارک شاہ کا یہ شعر اردو ادب کا ایک ایسا گوہر ہے جو نہ صرف زبان و بیان کی خوبصورتی کا حامل ہے بل کہ انسانی نفسیات، سماجیات اور مابعد الطبیعیات کو یکجا کرتا ہے- یہ شعر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں دوسرے انسانوں کے ساتھ ہمارا رویہ درحقیقت خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی عکاسی کرتا ہے- لہٰذا، ہر انسان کی عزت و تکریم ہمارا مذہبی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے-

اور اکی تنقیدی تھیوری کے اطلاق سے یہ شعر محض اخلاقی ہدایت یا صوفیانہ خیال نہیں رہتا بل کہ قاری کے شعور کی کایا پلٹ دیتا ہے- اس کے ادراک میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ ہر انسان کو احترام دینا دراصل خدا کی تعظیم ہے - یوں شعر اپنی معنوی طاقت کے ذریعے قاری کے ذہن اور کردار دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے-

☆☆☆☆☆

ادب، بایاں بازو اور ترقی پسندی

وہ انگلستان کا بادشاہ چارلس اول تھا۔ جس نے اپنے زمانے میں زرعی اصلاحات کیں۔ یعنی زرعی نظام میں کچھ مثبت تبدیلیاں کیں تو بادشاہ کا ایوان دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک گروپ وہ جو اصلاحات کے حق میں تھا۔ دوسرا وہ جو ان اصلاحات کا مخالف تھا۔ جو لوگ ان اصلاحات کے مخالف تھے وہ بادشاہ کے دائیں جانب بیٹھتے تھے اور جو ان تبدیلیوں کے حق میں تھے وہ ایوان میں بادشاہ کے بائیں جانب بیٹھتے تھے۔

ان اصلاحات اور تبدیلیوں پر دائیں جانب یعنی اصلاحات کی مخالفت کرنے والے دھڑے کی طرف سے جو دلائل پیش کیے جاتے تھے۔ اخبارات اپنی آسانی کے لیے انھیں دائیں بازو کے دلائل لکھتے اور اصلاحات ک حق میں جو دلائل دیئے جاتے انھیں بائیں بازو کے دلائل لکھتے کیونکہ یہ لوگ ایوان میں بادشاہ کے بائیں جانب بیٹھتے تھے۔

تب سے یہ الفاظ سیاست میں اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

دائیں بازو سے مراد وہ لوگ لیے جاتے ہیں جو معاشرے کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے میں کسی قسم کی تبدیلی کی زبردست مخالفت کرتے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والے ارتقاء اور ترقی لانے والی قوتوں کے خلاف جنگ جاری رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس بائیں بازو سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں بہتری کے لیے بنیادی تبدیلیاں لانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ معاشرے کی ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخ دانوں نے جب ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالی تو ہر معاشرے میں اور ہر عہد میں دو قوتیں برسرِپیکار پائیں اور ہر عہد میں بائیں بازو کی جدوجہد سے ہونے والی ترقی کا سراغ لگایا۔ ہر دور کی ریاستی طاقتوں نے ترقی پسند اور سیاسی و سماجی تبدیلیاں لانے والے افراد کی مخالفت کی اور انھیں سختی سے کچلا جاتا رہا۔

مسلمان حکمرانوں نے بھی ظلم و ستم کا یہ سلسلہ خلافت راشدہ کے بعد شروع کیا اور تا حال جاری رہے۔ اگر سلجوقی حکمرانوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے گیارھویں صدی میں امام غزالی کو استعمال کیا تھا تو پاکستانی ریاست نے بھی کام بیسویں صدی میں مولانا مودودی سے لیا۔ دائیں بازو کی ان

طاہر شبیر

رجعت پرست قوتوں کا سلسلہ آج بھی القاعدہ، طالبان اور داعش کے روپ میں جاری ہے۔ جن کو مسلمان ممالک کے حکمرانوں اور سامراجی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس لڑائی کو عقل پرست اور عقیدہ پرستوں کی لڑائی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ عقیدہ پرست ہمیشہ عقل اور شعور کے مخالف ہوتے ہیں۔ عقیدہ پرستوں کو ہر دور میں حکمرانوں اور ریاستی قوتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور ریاست عقیدہ پرستوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔
ان قدامت پرست قوتوں کی مخالفت میں جو اہلِ قلم اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر معاشرے کی بھلائی کے لیے اپنے تحریری اور تخلیقی سفر کو جاری رکھتے ہیں انھیں بائیں بازو کے لکھاری یا ترقی پسند مصنفین کہا جاتا ہے۔
ترقی پسند ادیبوں نے اُمرا کی خواہشات اور شاہوں کے قصیدوں کو چھوڑ کر عوام کے دکھ سکھ کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ترقی پسندوں نے سامراجیوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف انسانی تاریخ میں پہلی بار مزدوروں، کسانوں اور مظلوم انسانوں کی حمایت کو ایک تحریک کی شکل دے کر اپنی تحریروں میں شامل کیا۔
مشترکہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد ترقی پسندوں نے ادب کو محض دل بہلاوے کی چیز ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے نے صرف عشق و عاشقی کے راگ الاپنے کے بجائے حیات کے مسائل پر غور کرنا اور ان کا حل نکالنا شروع کیا۔ کیونکہ ترقی پسند اور مارکسسٹ ادیبوں کو جہاں انسانی مسائل کا ادراک ہوتا ہے وہاں ان کے پاس ان مسائل کو حل کرنے کا فہم بھی ہوتی ہے۔
ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کل ہند کانفرنس کے موقع پر مولانا حسرت موہانی نے تو یہاں تک کہا کہ محض ترقی پسند کافی نہیں جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی ہوگی۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں قطعی کوئی تضاد نہیں۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس بات کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔ یہاں سرسیّد یا علی گڑھ تحریک کا کذکر کرنے سے پہلے برصغیر پاک و ہند کی مختلف زبانوں کے ادب کی ترقی کے لیے فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔
فورٹ ولیم کالج کلکتہ: برصغیر پاک و ہند میں مغربی طرز کا پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو لارڈ ولزلی گورنر جنرل (1798 تا 1805) کے حکم سے 1800 میں کلکتہ میں قائم ہوا کالج قائم کرنے کا فیصلہ گورنر جنرل نے باجلاس (10 جولائی 1800) 17 صفر 1215ھ کو کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ کالج کا یوم

تاسیس 24 مئی 1800 تصور کیا جائے کیونکہ وہ دن سلطان ٹیپو کے دارالحکومت سرنگاپٹم کے سقوط کی پہلی سالگرہ کا دن تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ تعلیم 24 نومبر 1800 سے شروع ہوئی۔ پہلے دن فقط عربی کا درس دیا گیا، دوسرے دن فارسی کا اور تیسرے دن یعنی 26 نومبر کو ہندوستانی (اُردو) زبان کی باری آئی۔

جدید اُردو نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ یہ کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی تھیں جو زبان تھوڑے فرق کے ساتھ دہلی لکھنو اور شمالی ہند کے دوسرے تہذیبی مراکز میں بولی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی میں اُردو شاعری کی زبان بھی قریب قریب یہی تھی۔ البتہ اس زبان میں نثر نگاری کا رواج ابھی عام نہیں ہوا تھا کیونکہ درباروں، سرکاری دفاتر حتیٰ کہ خط و کتابت کی زبان ابھی تک فارسی تھی۔ اگر کبھی اردو نثر میں کچھ لکھا بھی جاتا تھا تو فارسی اور عربی کی اتنی بھرمار ہوتی تھی کہ عام آدمی اس مصنوعی زبان کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اس بالمقابل ہندوی (سنسکرت) تھی جو شمالی ہند کی قدیم بولی تھی۔ ہندوی کے بارے میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی رائے یہ تھی کہ ہندوی فارسی کی ضد ہے ناگری رسم الخط میں بائیں سے دائیں جانب کو لکھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے غلبے سے پہلے ناگری رسم الخط کی ہندوستان میں وہی حیثیت تھی جو یورپ میں اس وقت 1796 رومن رسم الخط کی ہے لیکن مدت ہوئی کہ ناگری کی جگہ عربی اور فارسی نے لے لی ہے۔ مسلمان ہندی جانتے ہیں اوران ہندوؤں کی تعداد بھی زیادہ نہیں جو ہندوی جانتے ہیں۔ لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہی مناسب خیال کیا کہ اُردو کے فارسی آمیز طرزِ تحریر اور ہندوی دونوں سے گریز کیا جائے اور اس زبان کو اپنایا جائے جو شمالی ہند کے تہذیبی مرکزوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس زبان کا نام ہندوستانی زبان رکھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی رائے میں ہندوستانی زبان تین زبانوں سے مل کر بنی۔ ہندی، عربی اور فارسی۔

اس زبان کا بالائی ڈھانچہ فارسی اور عربی کی آمیزش سے تیار ہوا۔ البتہ اس کی بنیاد ہندی ہے۔ جدید اُردو نثر کی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔

ہماری نظروں سے اب تک فورٹ ولیم کالج سے پیشتر کی ایسی کوئی تصنیف نہیں گزری تھی جو جدید اُردو نثر میں لکھی گئی ہو مگر گلکرسٹ (جس کو ہندوستانی (اُردو) زبان سے والہانہ محبت تھی) کی کتاب ''مشرقی زبان دان'' کے مطالعے سے پتا چلا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو فورٹ ولیم کالج سے پیشتر ہندوستانی یا جدید اُردو میں لکھی گئی۔ ''آئین لشکری'' غالباً ان میں سب سے قدیم تحریر ہے۔ اس

لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ ''آئین لشکری'' جدید اُردو کی پہلی کتاب ہے۔

''آئین لشکری'' وہ قواعد و ضوابط ہیں۔ جن کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی سپاہیوں کو اپنی دیسی فوج کی بھرتی کرتی تھی۔ یہ قواعدہ وضوابط انگریزی زبان میں تھے۔ 1796 میں کرنل ولیم اسکاٹ نے ان کا فارسی اور ہندوستانی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستانی ترجمے کی اصلاح ڈاکٹر گلکرسٹ نے کی۔

24 نومبر 1800ء سے کالج میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ بالخصوص ہندوستانی (اُردو) اور فارسی پر کیونکہ ہندوستانی زبان شمالی ہند کی بول چال کی زبان تھی اور فارسی پورے ملک کی ابھی دفتری اور درباری زبان تھی۔ لہٰذا انگریز پروفیسروں کی مدد کے لیے ہر شعبے میں دیسی منشی اور پنڈت ملازم رکھے گئے جن کی تنخواہ انگریز پروفیسروں سے بہت کم تھی - ان منشیوں کا کام درس تدریس میں انگریز اُستادوں کا ہاتھ بٹانا اور طلباء کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کرنا تھا۔

ابتدا میں فارسی کے تین، ہندوستانی (اُردو) کے بارہ بنگالی کے چھ اور عرب کے چار منشی مقرر ہوئے - لیکن ہندوستانی (اُردو) زبان کی مقبولیت کے پیش نظر جلد ہی ہندوستانی منشیوں کی تعداد 25 تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی تجویز پر ہندوستانی (اُردو) کے شعبے میں ایک قصہ خواں بھی مقرر تھا جو طلباء کو ان کی قیام گاہ پر جا کر داستانیں اور قصے سناتا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ فورٹ ولیم کالج انگلستان سے آنے والے انگریز افسران، ملازمین اور فوجیوں کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا، تا کہ حکمران طبقہ عوام کی زبان کو سمجھ سکے۔

ہندوستانی (اُردو) زبان کے چیف منشی میر بہادر علی حسینی مصنف، ''اخلاق ہندی و نقلیات لقمانی'' تھے۔ عام منشیوں میں قابل ذکر میر امن دہلوی مصنف ''باغ و بہار''، حیدر بخش حیدر مصنف ''آرائش محل و توطا کہانی''۔ کاظم علی جوان مصنف سنگھاسن، بیتسی وبارہ ماسہ''۔ میر شیر علی افسوس مصنف ''باغ اُردو'' اور خلیل علی خان اشک مصنف ''داستان امیر حمزہ'' تھے۔

اساتذہ اور منشی صاحبان درس دینے کے علاوہ طلباء کے لیے کتابیں بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں لغتیں، تواریخ اخلاقی، مذہبی اور قصے کہانیوں کی کتابیں بڑی تعداد میں تیار ہوئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر اساتذہ اور منشیوں کی تصانیف ہیں۔ لیکن دوسرے مصنفوں کی کتابیں بھی منظور کی جاتی تھیں۔ مثلاً باسط خاں، ''گل صنوبر شاکر علی کی الف لیلیٰ'' نہال چند لاہوری کا قصہ ''گل

بکاؤلی' مرزا علی لطف کی ''گلشن ہند'' کالج کے زیر اہتمام چھپیں، حالانکہ ان کتابوں کے مصنف کالج سے وابستہ نہ تھے۔
فورٹ ولیم کالج سے پیشتر اُردو نثر کی کوئی کتاب بول چال کی آسانی زبان میں موجود نہ تھی اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جدید اُردو نثر کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی۔ فورٹ ولیم کالج سے پیشتر اُردو نثر اور نظم کی کتابیں قلمی ہوتی تھیں اس لیے عام لوگ ان سے محروم رہتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کی بدولت اُردو کتابیں ہزاروں کی تعداد میں چھاپے خانوں میں چھپنے لگیں۔ اس طرح اُردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اُردو زبان و ادب زندہ ہیں ولیم کالج کا نام بھی زندہ رہے گا۔ جنوری 1854ء میں فورٹ ولیم کالج کا وجود ختم کر دیا گیا۔
اب تک جو ادب تخلیق ہوتا تھا اس میں کوئی مقصدیت نہ تھی بل کہ یہ ادب برائے ادب ہی ہوتا تھا۔ سرسید تحریک نے ادب میں مقصدیت پیدا کی۔ اس تحریک میں اُردو ادب کے عناصر خمسہ کا کردار بہت اہم ہے۔ جن میں سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا محمد حسین آزاد شامل ہیں۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد ادب میں مقصدیت کے حمایتی تھے لیکن قدامت پرست نظریات رکھتے تھے۔ باقی چار عناصر ترقی پسند خیالات رکھتے تھے اور ادب میں مقصدیت کے حمایتی تھے۔ اس وقت کے ادب برائے ادب لکھنے والوں نے اس تحریک کی کھل کر مخالفت کی لیکن اس کے سفر کو روکا نہیں جا سکا کچھ لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کو سرسید تحریک کا تسلسل سمجھتے ہیں جو درست نہیں ہے کیونکہ سرسید تحریک ایک علمی اور جدت پسند تحریک تھی جو مسلمان کو ذہنی طور پر سائنس، انگریزی او جدید علوم سیکھنے کے لیے آمادہ کرتی تھی۔ اس تحریک نے سماجی ناانصافیوں اور ظلم و جبر کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ عورتوں کی آزادی، حقوق نسواں اور عورتوں کی تعلیم پر کوئی زور نہیں دیا اور نہ ہی نچلے طبقات یا پسے ہوئے مظلوم لوگوں کی بھلائی کے لیے کوئی تحریری یا عملی کام کیا۔ سرسید تحریک میں جو لوگ شامل تھے وہ اپنے سماجی مرتبے سے کم سطح پر آنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔
اس کے برعکس انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج میں ظلم و ستم کے ذمہ دار جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کو بے نقاب کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے پسے ہوئے مظلوم طبقات کی کھل کر حمایت کی۔ انھوں نے آزادی نسواں، عورتوں کے سیاسی و سماجی حقوق اور ورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے تحریری اور عملی کام کیا۔ آزادی نسواں اور عورتوں کی تعلیم کی مخالف رجعت پرست قوتوں کا

ترقی پسند ادیبوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی یہ جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ بدقسمتی سے ہر حکمران کی طرح پاکستانی حکمران بھی اس ملک کو لق و دق صحرا بنانا چاہتے ہیں۔ اہلِ ہوس دکھ اور آسائشوں کی مساویانہ تقسیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جس کا نتیجہ بدترین انارکی کی صورت میں کسی وقت بھی ملک کے گلی کوچوں میں نمودار ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و افکار سے عوام میں نئی زندگی کی رُوح پھونکیں۔ بیداری، جوش اور انقلاب کے گیت لائیں۔ ہر مایوس انسان کو امید اور خوشی کا پیغام سنائیں اور سماج میں بسنے والے کسی انسان کو ناکارہ نہ ہونے دیں۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جو اس سماج کو بدترین انارکی سے بچا سکتا ہے عوام کے شعور کی سطح بلند کیے بغیر کسی انقلاب کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں اور سماجی شعور کو بڑھاوا دینے میں شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ بہتر کردار کوئی ادا نہیں کر سکتا۔

آئیں آج ہم عہد کریں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے شروع کیا تھا۔ جس میں فیض احمد فیض، سید سبطِ حسن، حمید اختر، ساحر لدھیانوی، حبیب جالب، احمد فراز اور ظہیر کاشمیری جیسے عظیم لوگ شامل ہوئے ہم اس سفر کو جاری رکھیں گے۔

ترقی پسند فکر اور علم کی اس شمع کو اگلی نسلوں تک لے جائیں گے چاہے ہمیں کتنے ہی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنے پڑے گا۔ سچا مارکسسٹ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس دنیا کے مسائل کا حل مارکسزم کے علاوہ کسی اور نظام میں نہیں ہے۔ سید سجاد ظہیر کا کہنا کہ ہمارے نزدیک ہر وہ ادیب جو ملک کی آزادی اور جمہوریت کے لیے لکھتا ہے۔ ترقی پسند ادیب ہے لیکن مولانا حسرت موہانی اس قسم کی رعایت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند ادیب کا اشتراکیت پسند یا کمیونسٹ ہونا ضروری تھا۔

ہم مولانا حسرت موہانی سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کیونکہ مارکسزم سماجی شعور کی بلند ترین سطح ہے اور یہی ترقی پسند اور ادیبوں کی منزل ہے۔

ہم ہر مذہب کے ٹھیکیداروں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ کسی مذہب کا خدا سرمایہ داروں، لٹیروں اور ظالموں کا حامی نہیں ہو سکتا۔ کسی مذہب کا خدا سماجی ناانصافی اور معاشی عدم مساوات کو پسند نہیں کرتا۔ اس دنیا میں اب سامراج کا نافذ کردہ حکم و جبر کا نظام نہیں چلے گا۔ اب اس طبقاتی نظام کا خاتمہ ہونے والا ہے اور سماجی و معاشی کے نظام مارکسزم کی منزل بہت قریب ہے۔

حوالہ جات:

”ادب اور روشن خیالی“، سبطِ حسن،
مرتب: ڈاکٹر جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی۔
”روشنائی“ سید سجاد ظہیر، مکتبہ دانیال، کراچی۔

☆☆☆☆☆

''اُجاغ میں پڑی ہے راکھ'' اور آفتاب خان

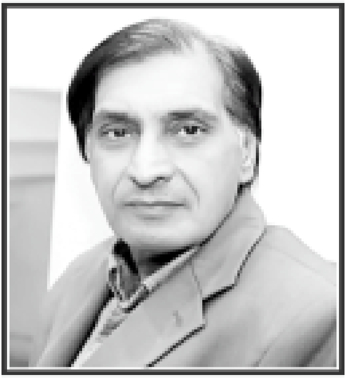

علم و ادب اور تہذیب و ثقافت سے اپنی گہری شیفتگی اور فنی و مطالعاتی ریاضت کے باوصف آفتاب خان اُردو ادب کے معاصر شعری اور نثری منظرنامے میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ فنی پہچان کے یہی رنگ ان کے تخلیقی سفر کا حاصل ہیں۔ ان کی غزلیں تخلیق کے مروجہ برتاؤ سے الگ ایک نئی راہ بناتی ہوئی اپنے قارئین سے داد طلب ہوتی ہیں۔ ''اجاغ میں پڑی ہے راکھ'' ان کا تازہ غزلیہ مجموعہ ہے جو اظہار کے انفرادی طرزِ احساس کا امتیاز لیے ہوئے ہے۔

مذکورہ مجموعے سے قبل 2015 میں جب اُن کا اولین شعری مجموعہ ''شام'' کے نام سے شائع ہوا تو اُسے بھی ناقدینِ غزل نے پسندیدگی کی سند عطا کی مگر موجودہ مجموعے کی غزلوں میں انھوں نے فنی انفرادیت کے رنگ کچھ اور گہرے اور رنگین بنا کر پیش کیے۔ مذکورہ مجموعے میں فن کی پختگی، جذبے کے خلوص سے ہم آہنگ ہو کر اور لفظیات کے چناؤ کا وصف پا کر شعری بیان کی کئی نئی جہتوں کو اپنا ہم نوا بناتی ہے۔ یہ ایک نہایت شائستہ و فطین شاعر کا کلام ہے جس کی جنم بھومی تو پھولوں کا شہر پشاور ہے لیکن جسے ''زندہ دلانِ لاہور'' نے خلوص و محبت کی بانہوں میں سمیٹ کر کچھ یوں سینے سے لگا رکھا ہے کہ اب لاہور ہی اس کا مستقل مستقر بن گیا ہے۔

اپنے موضوعاتی برتاؤ کے اعتبار سے اُن کی شاعری کا مرکزی طرزِ احساس، محبت اور معاملاتِ محبت کے رازہائے دروں کا بیان ہے۔ غزل کی سرشت میں شامل عشق کے فطری اور ازلی جذبے کا صداقت پسندانہ

نثار ترابی

اظہار، اُن کی غزلوں کا ایک اساسی موضوعاتی رویّہ بن کر اُن کے فنِ غزل گوئی کا امتیاز بنتا ہے۔ ان کے ہاں عاشقانہ طرزِ احساس میں بسا ہوا یہ جہانِ شاعری، اپنے اندر احساسات و جذبات کے ایسے الاؤ روشن کرتا ہے جن میں اظہار کی گرمی اور جذبے کی وارفتگی سے گلے ملتا ہوا ایک زندگی بخش لمس کا احساس کروٹیں لے رہا ہے۔ ان کے ہاں عشقیہ اظہار بدن کی پکار کے فطری تقاضوں کے دوش بدوش اپنی بے باک تمناؤں کو وجودی حیثیت سے نمایاں کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس مقام تک آتے آتے ہمیں کلامِ آفتاب کے روپ میں ولی، مصحفی اور داغ کی یاد آنے لگتی ہے ۔

غزل کی سرشت میں شامل جذبۂ عشق اس صداقت پسندانہ اظہار پر جب غور کریں تو غزل کے دو بے پناہ شعرا احمد مشتاق اور احمد فراز یاد آنے لگتے ہیں۔احمد فراز کا کہنا ہے:

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں، تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

اور احمد مشتاق کہتے ہیں:

زندگی معرکۂ روح و بدن ہے مشتاق
عشق کے ساتھ ضروری ہے ہوس کا ہونا

....

عشق اور معاملاتِ عشق یا دوسرے لفظوں میں ''معاملات'' کی شاعری کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو غزل کی قدیم شعری روایت کے طے شدہ موضوعاتی دائرہ کار سے الگ اور ایک نیا جہانِ معنی کا در وا کرتی ہوئی غزل کی یہ جدید روایت جو فراز و احمد مشتاق سے ہوتی ہوئی آفتاب خان تک آتی ہے تو اس میں عشق کے ماورائی تصور کے سامنے گریز کا بیانیہ ایک نمایاں رویّہ بن کر غزل کی نئی روایت کی تشکیل سازی کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس عشقیہ اظہار میں تجربات و احساسات کی گرمی بھی ہے اور منہ زور فطری جذبات کی تپش بھی۔ اس میں زندگی کے جیتے جاگتے لمس کا احساس کروٹیں لے رہا ہے۔ شاعر کے ہاں عشقیہ اظہار بدن کی پکار کے تقاضوں کے ساتھ اپنی بے باک تمناؤں کو وجودی حیثیت سے نمائش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔

چھوٹتی ہی جا رہی تھیں جسم سے انگڑائیاں!
شب کو جب میں نے اُسے اپنا لبادہ کر دیا

بدن کی چاندنی لے کر کہاں وہ دن میں آئے گا
اُسے تو شام سے پہلے پکارا جا نہیں سکتا

بوسے کی حرارت سے بدن سرخ ہُوا
جب لمس ملے ہاتھ کا، نم کیوں نہ جبیں ہو

....

مجموعہ کے صفحہ 78 اور 79 پر درج دو غیر مُردف غزلوں میں ایک ہی طرز و آہنگ کے حامل قوافی میں فنی توانائیوں کے جوہر آزمائے ہیں۔ قوافی میں نوید، عید، کشید،

مزید، ثرید، مفید، شدید، مدید وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں یہ دو شعر دیکھیے جن میں فنِ غزل گوئی میں عروض کے شعورانہ احساس کو اُجاگر کرتے ہوئے شاعر نے اپنا نظریہ فن یوں پیش کیا:

شاید تمھیں عروض سے کچھ واسطہ نہیں
اوزان منسرح کے ہیں تم نے کہا مدید

ہر اک غزل میں گوندھیے شعری لوازمات
اجزائے خاص جذب ہوں بنتا ہے تب ثرید

اُجاغ میں پڑی ہے راکھ ہاتھ مت سیاہ کر
نہ یوں بہشت کے مکیں زمین پر گناہ کر

....

مذکورہ غزل نو اشعار پر مشتمل ہے، جسے مجموعے کی ایک نمائندہ اور مرکزی غزل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ساری غزل شاعر کے نظریہء ادب ہی نہیں، اُس کے نظریہء زندگی کی بھی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے۔ ایک درسِ محبت، ایک مقصدِ حیات، ایک پیغامِ فن اور ایک احساسِ انسانیت اِس غزل کے مصرعے مصرعے سے عیاں ہے:

وہ جو کہا گیا کہ:

دردِ دل کے واسطے اک آہ کی تھی یہ نہ سوچا تھا
کہ یہ تو اور بھی دل کا سکوں برباد کرتی ہے

....

گویا آہ سکوں کے اظہار کے لیے نہیں دُکھ میں شدت کا باعث بننے والی کیفیت ہے۔

اس موضوعاتی کیفیت کا تسلسل قدیم سے جدید شعری روایت میں تاریخِ ادب کا حصہ ہے مگر آفتاب خان کے ہاں اسی کیفیت کو مثبت اندازِ نظر کے حامل مزاج کا حسن عطا ہوا ہے۔ وہ مثبت اندازِ نظر، جو انسان دوست جذبوں کا عکاس ہے اور جس کی نمائندگی میر درد کے اِس مشہورِ زمانہ شعر میں کیا خوب ہوئی ہے کہ:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

....

یعنی مخلوقِ خدا کے لیے دردِ دل رکھنا حقیقی معنوں میں ایک انسانیت بخشش احساس ہے جو بندے کو انسانیت کی منزہ اور روشن روایت سے جوڑتا ہے۔ اب ذرا فکرِ آفتاب سے اِس موضوعاتی چمک کی جھلک ملاحظہ ہو۔

مزاج چھوڑ تُند خُو، نہ زہر دل میں گھول تُو
کسی کے درد کو سمجھ، کسی کے دُکھ میں آہ کر

....

یہاں کسی دوسرے انسان کے دکھ میں آہ کرنا، گویا دردِ دل میں شامل ہونے کا اعزاز پانا ہے۔ اِسی طرح زیرِ بحث غزل کے باقی اشعار میں اخلاقی اقدار کی ترجمانی کے ایسے زاویے سامنے آتے ہیں کہ ان کے باطن سے صوفیانہ اندازِ نظر کی حامل شاعری کا احساس اُجاگر ہوتا محسوس ہوتا ہے:

عداوتیں فضول ہیں، یہ نفرتیں ببول ہیں
کسی کو دیکھ مسکرا کے، پیار کی نگاہ کر

نہ خار بن گلوں میں ڈھل، صراطِ مستقیم چل
حیات سوچتی ہے جو، وہ کام گاہ گاہ کر

....

حمدیہ اور نعتیہ تخلیق میں بھی شاعر نے اظہار میں لفظی و معنوی اصطلاحی رعایتوں کا لحاظ بہت قرینے سے روا رکھا ہے مثلاً صفحہ 43 پر موجود گیارہ اشعار پر مشتمل نعت جس کا مطلع ہے۔

مہکی فضا ہے آپؐ کے نعلین چوم کر
آئی صبا ہے آپؐ کے نعلین چوم کر

....

میں شاعر نے ایک طویل ردیف استعمال میں لا کر ایک ایسا تخلیقی تجربہ کیا ہے جو نعتیہ ادب کی شعری روایت میں اپنی ایک فنی انفرادیت رکھتا ہے۔ مذکورہ نعت کے قوافی بالاترتیب فضا، صبا، کھلا، ملا، کیا، پڑھا، گیا، جھومتا اور ہُوا ہیں۔

آپؐ کے نعلین چوم کر __ اب یہی ساری ردیف ہے اور مصرع کے آغاز میں ردیف سے قبل مصرع اولیٰ میں صرف دو لفظوں کے استعمال سے شعر کی ہر اکائی ایک مکمل موضوعاتی دائرہ وسعت میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

استادانہ رنگِ شعری کے نمونے بھی کئی مقامات پر اپنے تیور دکھاتے ہیں۔ مثلاً کتاب کے صفحہ 148 پر آمنے سامنے دو غزلیں ایسی ہیں جن کے مطلع بالاترتیب یوں ہیں۔

حصارِ ہجر میں آہو کو ہوں دبوچ رہا
عجیب شخص ہوں، کس کا بدن ہُوں نوچ رہا

....

نہ اُس کے دِل میں دھڑکنے کا یار سوچ ابھی
کہ پتھروں میں نہ پیدا ہُوا ہے لوچ ابھی

ہر دو غزلوں کے سات سات اشعار کو ایک ہی مزاج اور ایک ہی قبیل کے الفاظ کو بطور قافیہ برتتا ہے۔ یہ الفاظ اُردو کی شعری روایت میں بہت کم استعمال ہوئے ہیں مثلاً نوچ، کھروچ، موچ، کوچ، کاکروچ وغیرہ __ اسی طرح فنی ہُنر کاری کی جانب شاعر نے خود کو شعوری طور پر جگہ جگہ بیدار رکھا ہے اور جہاں بیدار رکھا ہے وہاں اُس کی شعری گواہیاں ایک اُستادِ فن کی طرح پیش کی ہیں:

سخن میں اُس کو اناڑی ابھی سمجھتا ہوں
غزل میں لائے وہ الفاظ مبتذل دیکھو

....

آفتاب خان کی تخلیقی فعالیت میں ایک حساس کہانی کار کی خوبی بھی اپنی موجودگی کا پتا دیتی ہے کیوں کہ انھوں نے کئی افسانے تخلیق کیے ہیں __ کہانی پن سے اپنی اِس وابستگی کو انھوں نے شعری تخلیق کے لمحوں میں بھی یاد رکھا ہے۔ کئی شعروں میں جہاں محاوراتی مفہوم کو خیال کی جدت طرازی سے ہم کنار کیا ہے وہاں موضوع کی انفرادیت لَو دینے لگی ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ لفظ بھی اُسی قرینے سے استعمال

کیے ہیں۔ مثلاً

کی میں نے ساز باز کہانی نگار سے
آؤں گا اب نظر تجھے اگلے بھی سین میں

....

متعدد غزلوں میں اپنے عصر کی بے چینیوں کو سمیٹتے ہوئے ایسے سماجی اور سیاسی حقائق کی پردہ کشائی بھی کی ہے جن کا سامنا روزمرہ زندگی میں آج کے انسان کا مقدر ہے۔ اسی طرز کی تخلیقی رو جہاں مجسّم ہوئی عصری صداقت کی ہم نوا بن گئی ہے۔

جب گواہوں کے لبوں پر چپ کے تالے پڑ گئے
منصفوں کے کوٹ کیا، چہرے بھی کالے پڑ گئے

گاؤں کے کچے مکانوں میں بہت محفوظ تھے
شہر میں آ کر ہمیں جانوں کے لالے پڑ گئے

....

"اُجاغ میں پڑی ہے راکھ" میں جن الفاظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اُن میں سب سے نمایاں لفظ "عشق" ہے جسے ترکیبی استعمال میں لاتے ہوئے شاعر نے ایک طویل غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے:

بھٹک رہی ہے کسی دشت میں نوائے عشق
پکارتی ہے یہی، عشق دے خدائے عشق

....

99 شعروں پر مشتمل اس غزل میں جب رُومان انگیز اور رُومان پرور سچائیاں متنوع کیفیات میں ڈوبتی ابھرتی ہیں تو جمالیاتی اظہار میں عجب لُطف و انبساط کے ذائقے گُھلے ملنے لگتے ہیں:

کوئی حسین بھی یوسف سا مصر کو نہ ملا
کسی کسی کو زلیخا یہاں بنائے عشق

سیارگانِ محبت پہ جا دھمال کروں
مجھے بھی کاش خلاؤں میں لے کے جائے عشق

درخت جھوم رہے ہیں نظر ملائے عشق
کسی کے عشق میں ہر شاخ گنگنائے عشق

جہاں گلاب چنبیلی سے دُور دُور ہوئے
وہاں چلی ہی نہیں تیز تر ہوائے عشق

یہ کائنات کسی عشق کی عنایت ہے
اب اور کیا ہے ضروری ذرا بتائے عشق

....

ان اشعار میں کہیں تلمیحاتی وسیلے سے قلبی جذبوں کی پکار بلند ہوتی ہے تو کہیں کسی نادر تشبیہ سے شعری مفہوم واضح کرنے کا وصف ملتا ہے۔ شاعر کا ایمان ہے کہ جہاں جہاں بھی گلاب، چنبیلی سے دور ہوئے وہاں وہاں ہوائے عشق کا گزر ہی نہیں ہُوا۔ یہ کائنات بھی عشق کی عنایت ہے۔ یہ وہ لازوال جذبہ ہے جسے قریب کرے اُس کے غم تو کیا اُس کے ناز بھی اُٹھاتا ہے اور جسے اپنا مُرید کرے اُس کا جیون بھی سنوار دیتا ہے۔ ممتاز شاعر عبیداللہ علیم کی آواز دھیان میں آتی ہے:

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

عشقیہ رنگ کی جدا جدا موضوعاتی تصویر کشی کے دوران شاعر نے کئی مقامات پر اچھوتے تخلیقی زاویے اپنے شعری اظہار میں مجسم کر دیے ہیں۔

اینٹی غزل کے کچھ نمونے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اینٹی غزل کا دورانیہ بہت کم رہا۔ یہ الگ بات کہ آج کل الیکٹرانک میڈیا پر روزانہ کی بنیاد پر دکھائی اور سنائی جانے والی ایسی شاعری جو زیادہ تر بے اُستادا اور نوآموز تک بندوں پر مشتمل ہے اسی اینٹی غزل کی نمائندگی کرتی ہے۔

ہمارے ہاں مظہر امام، انور شعور، سلیم احمد، ظفر اقبال سے ہوتی ہوئی روایت کی یہ جھلک کئی موجودہ شعرا تک آ گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا شعری چلن تھا، جس نے کئی شعرا کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ ان شعرا میں وہ حقیقی شعرا جو غزل کے فن کی اساس میں کچھ نیا کرنے کی دُھن میں نمایاں ہوئے۔ اُن میں کچھ دیر کے لیے آفتاب خان بھی شامل ہو گئے۔ اس مزاج اور اسلوب کے حامل دیگر شعروں کے علاوہ ایک غزل میں دو شعر ایسے ہیں جو اس رنگ کی نشاندہی کرتے ہیں:

پانی میں اُس کا عکس لگا ناگوار جب
ایک اینٹ میں نے کھینچ کے ماری گلاس پر
رکھا ہے ننگی تار پہ خود میں نے اپنا ہاتھ
کرتے ہیں چند لوگ بھروسہ پلاس پر

مگر شاعر کا فنی کمال دیکھیے کہ لفظ گلاس اور پلاس دونوں انگریزی زبان کے لفظ ہیں ان کا تخلیقی استعمال اس طرح ہوا ہے کہ وہ اُردو کے مزاج اور روزمرہ سے ہم آہنگ ہو کر اپنا مفہوم واضح کر رہے ہیں۔

عہدِ اقبال کے بعد اقبال کی بخشی ہوئی اثر آفریں غزلیہ روایت سے اُسلوبیاتی، موضوعاتی اور اظہاراتی شکلوں میں بعد میں آنے والے غزل گوؤں کے ہاں نئی منظر نگاری میں ڈرامائی کیفیات کی موجودگی کا احساس بہت نمایاں ہو کر جن شعرا کے کلام میں سامنے آیا اُن میں حفیظ جالندھری، احسان دانش سمیت معاصر عہد تک جو چند شعرا ذیل میں نمایاں ہوئے اُن میں آفتاب خان کا نام بھی شامل کیا جانا چاہیے۔

معصوم سے چہرے پہ گھٹا آ کے جھکے یوں
گلشن میں شجر جیسے کوئی سجدہ نشیں ہو

چُوموں میں عقیدت سے تری چشمِ فسوں خیز
واں صرف مرے لب ہوں جہاں تیری جبیں ہو

دل سے یوں لپٹے ہو تم جیسے شجر سے کوئی بیل
ہو گئی یوں عشق کے درجات سے وابستگی

"اجاغ میں پڑی راکھ" ایک ایسا غزلیہ مجموعہ ہے، جس میں شاعر نے اپنے تخلص کا استعمال محض غزل تک محدود نہیں رکھا بلکہ تقدیسی ادب میں شامل جملہ اصنافِ شعری

مثلاً حمد، سلام وغیرہ میں بھی یکساں فکر وفنی رچاؤ اور اسلوب کی دل نواز اداؤں میں رچا بسا کر پیش کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر یہ چند شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

ترے کرم سے چمکتا ہے آفتاب یہاں
ترے کرم کا ہمیشہ ورود ہو جائے

میں اُس کے حُسنِ تجلی سے آفتاب ہُوا
مرا خلیق خدا ہے ، اجالتا ہے مجھے

یہ تازگی کہاں تھی رُخِ آفتاب پر
روشن ہُوا ہے آپ کے نعلین چُوم کر

یہ میرا عشق ، سرایت نہ تجھ میں کر جائے
مَیں آفتاب ہُوں، نظریں جما کے دیکھ مجھے

....

اب آخر میں اپنے اظہاریے کو سمیٹتے ہوئے اُس غزل کا حوالہ دینا چاہوں گا جو کنارے، اشارے، مارے، ستارے، شرارے، سارے، ہمارے اور بارے ایسے الفاظ کے حامل قوافی پر مشتمل ہے اور لاریب اس کے ہر ہر شعر میں سراپا نگاری اور شعری جمالیات کی مترنم کیفیات کا بیانیہ سُریلی اور میٹھی لے میں ڈھل گیا ہے۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے یہاں اس غزل کے دو شعر بہ طور حوالہ درج کرتا ہوں:

لبوں کے سُرخ کنارے کلام کرتے ہیں
وہ چُپ رہے تو اشارے کلام کرتے ہیں

میں بانٹتا ہوں بکثرت سکون بخش سخن
مجھی سے درد کے مارے کلام کرتے ہیں

....

دعا ہے کہ خدا کرے ہمارا یہ دلدار اور طرح دارِ سخن وریونہی اپنے پڑھنے اور سُننے والوں کے درمیان شعری بزم آرائیوں میں اپنا سکون بخش کلام سخاوت کرتا رہے کہ اس عطائے دلبری کے صدقے میں اِس سے سارے درد کے مارے کلام کرتے رہیں۔
اسے محبت سے سلام کرتے رہیں۔
ایک سنگ دل، ریاکار اور دوسروں کو برداشت نہ کرنے والے مصنوعی ذہانت کے حامل اور تہذیبی اعتبار سے زوال آمادہ معاشرے میں محبت کی اور اس شدت سے محبت کی بات کرنے والا یہ شخص کسی ادبی نعمت سے کم نہیں۔ خان صاحب کا وسیع حلقہ یاراں اس بات کا گواہ ہے کہ یہ شخص محبت کی محض بات ہی نہیں کرتا محبت کا پاس بھی رکھتا ہے، اسے نبھاتا اور اُس پہ ناز بھی کرتا ہے۔
جاگتی آنکھوں کے روشن منظر دھڑکتے دل کے مچلتے طوفان دیارِ عشق کے ہر ہر مرحلے پر ان کے فکر وفن کو جاوداں لمحوں کا حسن عطا کرتے رہیں گے اور یہ یوں ہی ہمارے درمیان سے گنگناتے، چھب دکھاتے، عشق محبت کے بھید بھاؤ بتاتے معاصر ادبی بزم آرائیوں کی رونق بنے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

میرا دوست خالد انکل

امیر حسین جعفری

واقعہ کوئی بھی عجیب نہیں
بود و نا بود کی کہانی میں
خاک پھر رزقِ خاک ٹھہری ہے

....

اختر حسین جعفری صاحب کی موت کے حوالے سے یوسف حسن صاحب کی اس نظم کے ابتدائیے کی معنویت اگرچہ ایک ازلی وابدی حقیقت ہے۔ مگر یہ ایسا بھی میکانکی عمل نہیں ہے جیسے اسے سماجی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے یا مذہبی اعتقادات کے باعث اس عمل کو تسلیم ورضا کا موضوع ٹھہرایا جاتا ہے۔ خالد احمد کی موت بھی بظاہر کوئی ایسا واقعہ نہیں جو

باعثِ تعجاب ہو۔ انسان پیدا ہوتے ہیں انسان مرتے ہیں مگر ان میں کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت یوں تو معمول کا واقعہ ہی ہوتی ہے مگر زندگی اور موت کے عمل کی مقصدیت اور معنویت کی ایسی شرح و تعبیر ہوتی ہے کہ زندگی اور موت کے عمل کی دوئی ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔

۱۹۹۳ء کے لگ بھگ پردہ سیمیں پر پیش کی جانے والی امریکی فلم The Last Samurai کی کہانی میرے اس دعوے کی عملی تفسیر و تمثیل ہے۔ یہ کہانی ۱۸۷۷ء میں جاپان پر امریکی سامراج کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تسلط کے حوالے سے کسی حد تک افسانوی کہانی ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار جو جاپانی تہذیب اور روایات کا امین ہے۔ مغربی تہذیب اپنانے کے عمل میں نظریاتی اور عملی سطح پر مزاحم ہوتا ہے۔ اس کی یہ مزاحمت بالآخر اس کی موت پر منتج ہوتی ہے۔ اس کی موت ہر خاص و عام کے دکھ کا باعث ٹھہرتی ہے۔ جاپان کا بادشاہ جب امریکی عمال کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے لگتا ہے تو وہ امریکی جو مزاحمت کے محاربے میں Samurai کا طرفدار ہوتا ہے۔ زخمی حالت میں دربار میں داخل ہوتا ہے۔ بادشاہ انتہائی دکھ کے عالم میں اس امریکی سے پوچھتا ہے کہ Samurai کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اس سوال پر امریکی، جو کہ Samurai کی صحبت میں رہنے کے باعث نظریاتی سطح پر تبدیل ہو چکا ہے، انتہائی Profound انداز میں کہتا ہے کہ یہ سوال بے معنی ہے وہ مرا کیسے؟۔ سوال تو یہ کہ وہ جیا کیسے؟---

اسی نوع کے ایک سوال کا جواب خالد احمد اپنی موت سے چند روز قبل اپنے مجموعۂ کلام نم گرفتہ کی تقریب رونمائی میں ان الفاظ میں دیتے ہیں میں صرف شعر کہنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میں نے تمام عمر شاعری کی، اپنے شب و روز شعرا کی صحبت میں بسر کیے۔ لوگ اپنے عرصۂ حیات میں بہت سے کام کرتے ہیں مگر نے شاعری کے سوا کوئی کام نہیں کیا-----

بلاشبہ خالد احمد نے شعر و ادب کی تخلیق و ترویج ہی کو اپنی زندگی کا اسلوب ٹھہرایا۔ خالد احمد شام کا آغاز لکشمی چوک کے کسی چائے خانے میں نوآموز شعرا کے کلام کی تصحیح سے کرتے۔ اور کبھی یوں ہوتا کہ شام پانچ یا چھ بجے پاک ٹی ہاؤس میں جو گفتگو آغاز ہوتی رات اا بجے، ٹی ہاؤس کے بند ہونے پر لکشمی چوک کے کسی چائے خانے میں دوبارہ چھڑتی اور یوں رات گئے تک گفتگو کئی ادوار میں جاری رہتی۔ خالد

صاحب کے دوست، محبان، نو آموز شعرا اور دیگر افراد رات کے مختلف پہروں میں چائے خانے میں نمودار ہوتے۔ ہر نو وارد کی آمد سے گفتگو اپنا رنگ بدلتی اور اس نووارد کی فکری اور علمی ضرورت کے مطابق خالد صاحب گفتگو کا رخ موڑتے۔ خالد صاحب ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے کہ ان کا مخاطب نہ صرف بحث میں شامل ہو بل کہ انتہائی غیر محسوس انداز میں اپنے علمی، تخلیقی خلا سے آگاہ بھی ہو سکے۔

خالد صاحب فکری یا فنی سقم کی نشاندہی کچھ اس انداز سے کرتے کہ سیکھنے والا خود کو علمی وفنی سطح پر تخلیق کار تصور کرنے لگتا۔ وہ نوجوان شعرا کے کلام کی قرأت کرتے ہوئے شعر کے کسی کلیدی لفظ کو اس طرح ادا کرتے کہ مفہوم واضح ہو جاتا۔ وہ نوجوان یا خالد صاحب کے وہ جونیئرز جو اوزان سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے تھے کے لیے خالد صاحب ان کے لیے ایسی دھنیں مرتب کرتے کہ بحور نہ صرف ان پہ کھل جاتیں بل کہ انھیں انتہائی آسان بھی معلوم ہونے لگتیں۔

انھوں نے نوجوان شعرا کی سہولت کے لیے بحروں کے مختلف نام بھی وضع کر رکھے تھے اور وہ اس لیے کہ تقطیع کا مرحلہ شاید ان کے لیے دشوار ہو۔ افغانی بحر، نظامی گنجوی کی بحر، یونانی بحر اور نہ جانے کیا کیا۔

خالد صاحب نوجوانوں کی غزلیں، نظمیں، گیت نہ صرف خود گاتے بل کہ انھیں بھی گنگنانے کا کہتے۔ ایک ایک مصرعے کو کئی بار گاتے اور مسلسل اسے تبدیل بھی کرتے رہتے۔ ایک شعر کی مختلف صورتیں وضع کرتے۔ شعر کو ایک سے زیادہ انداز میں کہنے کے ہنر کو Unfold کرتے۔ مذہب، فلسفہ، منطق، علم الکلام، تنقید، تحقیق، ڈرامہ نگاری، ڈاکومینٹری، فن شاعری، رموز شاعری غرض کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس پہ گفتگو نہ ہو۔ یہ گفتگو کبھی انتہائی شگفتہ اور کبھی انتہائی تلخ لہجہ بھی اختیار کرتی۔ خالد صاحب اپنا نقطہ نظر سمجھانے کے لیے کبھی Direct اور کبھی Indirect انداز اختیار کرتے۔ اکثر وہ نجیب صاحب یا مجھ سے مخاطب ہوتے۔ مجھ سے اس لیے مخاطب ہوتے کہ میں نہ صرف ان کی شاعری، بالخصوص تازہ تخلیقات کا پہلا سامع تھا اور ان کا چہیتا بل کہ بہت بے تکلف بھی تھا۔

'کیوں آپ نے نظم سے یہ لائن کیوں نکال دی؟'

'سر یہ لائن باقی مصروں کے مقابلے کچھ Bright لگ رہی تھی اس لیے نکال دی'

خالد صاحب انتہائی مودبانہ انداز میں کہنے لگے 'واہ واہ استادِ محترم کیا کہنے اچھا اب یہ تو بتایئے کہ ایسی لائن اگر رکھ لی جائے تو اس

سے نظم یا غزل کو فرق پڑتا ہے'

میں نے بھی استادانہ انداز میں کہا 'اچھی طرح سن لیں اور سمجھ بھی لیں دوبارہ نہیں بتاؤں گا شاعری کو، وہ نظم ہو کہ غزل Uniform ہونا چاہیے Comparatively brighter lines کے باعث باقی ماندہ مصرعے یا اشعار ماند پڑ جاتے ہیں اس لیے ایسی لائن کو نکال دینا چاہیے خواہ وہ لائن کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو بات سمجھ میں آئی کہ نہیں' میں انھیں مزید ستانے کے لیے کہتا کہ 'میں آپ لوگوں کے درمیان موجود ہوں مجھ سے جو سیکھنا ہے سیکھ لیں خدا جانے میرے بعد آپ لوگ کیا کریں گے' میری بات سن کر خالد صاحب نے انتہائی مودبانہ انداز سے میری طرف دیکھا میں نے ایسا تاثر دیا کہ وہ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود مسکرانے پر مجبور ہو گئے اور کہنے لگے کہ 'استادِ محترم ایک تازہ غزل آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو عرض کروں اور ہاں میں نے اگر کوئی فکری یا لسانی ٹھوکر کھائی ہو تو ازراہ کرم اس کی نشاندہی بھی فرما دیجیے گا'

ارشاد:

واہ واہ کا شور بلند ہوا خالد صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے 'جی استادِ محترم اس غزل کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟'

میں نے کہا کہ یہ مصرع آپ نے اس طرح کیوں کہا ہے اس طرح سے کیوں نہیں کہا' خالد صاحب خاموش رہے خالد صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان شاعر نے بھڑک کر کہا 'کہ اس مصرعے کو اسی طرح ہونا چاہیے جیسے خالد صاحب نے کہا ہے' میں نے جواباً کوئی بات کہی تو اس سے بحث کا آغاز ہو گیا۔ خالد صاحب اپنی خاموشی سے ایسی فضا قائم کر دیتے کہ نوآموز شعرا انتہائی اعتماد کے ساتھ مکالمے میں شامل ہو جاتے اور وہی اعتماد انھیں شعر کہنے کا حوصلہ دیتا۔ وہ نوجوان شعرا کے ساتھ گفتگو کے دوران عمر، علم اور اپنے شعری مرتبے کا فرق مٹا دیتے اور ان کے ساتھ ان کی علمی سطح پہ اتر کر بات کرتے۔ انھیں شعر کہنے پر اکساتے اور اگر اس کے باوجود کوئی نوجوان شعر کہنے کے عمل سے گریزاں رہتا تو وہ اسے چیلنج کرتے۔ میرے ساتھ ان کا یہی رشتہ تھا۔ گو اس رشتے کی بنیادیں جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب اختر حسین جعفری کی محبت پر استوار تھیں۔ خالد صاحب اپنی ذہانت، بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور تبحر علمی کے جعفری صاحب اور قاسمی صاحب، کو بے حد عزیز

تھے - ۱۹۹۰ کے اوائل میں، جب میں
شاعری کی طرف مائل ہوا تو میرے والد
یہ بات محسوس کرتے کہ میں قدرے جھجک
سے ان کے ساتھ اپنی شاعری
Discuss کرتا ہوں-ابا نے میری
جھجک کو بھانپتے ہوئے کہا کہ تم خالد کے
ساتھ اپنی شاعری Discuss کر لیا
کرو- دوسرے ہی صبح کوئی گیارہ بجے کے
قریب میں نے خالد صاحب کو فون
کیا- فون ریسیو کرتے ہی کہنے لگے کہ' لگتا
ہے آج میری خیر نہیں' میں نے کہا 'کیوں
خالد انکل کیا ہوا؟' کہنے لگے' آج دن کا
آغاز آپ کے فون سے ہو رہا ہے اللہ خیر
کرے، مجھ ناچیز کو کیسے یاد فرمایا آپ نے'
'میں نے ایک شعر کہا ہے' انتہائی خوشگوار
حیرت کے ساتھ کہنے لگے'ایک شعر کہا ہے
آپ نے واہ واہ کیا کہنے ایک شعر کر لیا ہے
آپ نے - بہت خوب' اچھا مجھے چڑائیں
مت پہلے شعر سن تو لیں:

جی ارشاد:

شعر سن کر قدرے توقف کے بعد مخاطب ہوئے
'ایک شعر تو آپ نے کہہ لیا مزید کیا ارادہ ہے؟
اب میں دوسرا شعر کہوں گا اور شعر کہتے ہی
آپ کو فون کروں گا-

خالد صاحب کہنے لگے کہ میں آپ کے فون
کا انتظار کروں گا- تقریباً ایک گھنٹے کے بعد
میں نے دوبارہ فون کیا اور میں نے انتہائی
Excitement کے ساتھ کہا کہ' خالد
انکل ایک شعر اور ہو گیا دوسری طرف سے
اسی Excitement سے آواز آئی
'ہیں ایک شعر اور اور ہو گیا بھئی کیا کہنے یہ
لڑکا خدا جانے کیا کرے گا-

خالد انکل یہ بتائیں کہ ایک غزل میں کتنے
اشعار ہونے چاہیے؟-

'جیسا کہ آپ کے علم میں ہے- اساتذہ تو
بہت طویل غزلیں کہتے تھے اور استاد ذوق
کی مثال بھی آپ کے سامنے ہے-
اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ایک غزل
میں کتنے اشعار کہتے ہیں'

'نہیں نہیں خالد انکل میں پانچ، سات سے
زیادہ شعر نہیں کہوں گا'

'چلیں نہ پانچ نہ سات آپ چھ اشعار کہہ لیں'
چھ شعر
ہاں
ٹھیک ہے فون بند ہو گیا-

کوئی دو گھنٹے کے بعد میں نے فون کیا اور
خالد صاحب کو مزید تین اشعار سنائے اور کہا
کہ اب پتہ چلا شاعری کسے کہتے ہیں آپ
بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں اور مجھے یہ بھی
خبر ہے کہ آپ نے مجھے داد کیوں نہیں دی---
خالد صاحب کہنے لگے کہ تم ہم سب سے
کہیں بہتر شاعر ہو ہمیشہ خوش رہو- فون بند

ہو گیا۔ شام کے وقت خالد صاحب کا فون
آیا میں نے اٹھاتے ہی کہا خالد انکل ابا تو
گھر پہ نہیں ہیں کہنے لگے:
مجھے آپ سے ہی بات کرنی ہے
جی خالد انکل فرمائیے
وہ چھٹے شعر کا کیا ہوا آپ نے سنایا ہی نہیں
اوہ خالد انکل میں بھول گیا کہ چھٹا شعر بھی
کہنا تھا۔ اصل میں آج ہمارا کرکٹ کا میچ
تھا۔ خالد انکل کیا بتاؤں آج میں نے کمال
کی بیٹنگ کی ہے۔
اچھا کیا بات ہے
جی خالد انکل باؤلر نے good length
سے بال Bounce کی میں نے بال
اٹھا کے باؤنڈری سے باہر پھینک دی
کیا کہنے بھئی تو آپ بال ہک کر لیتے ہیں
جی خالد انکل ہک، پل تو ایسا کرتا ہوں کہ
کیا بتاؤں
ماشاللہ کیا بات ہے آپ ہک اور پل بھی
کر لیتے ہیں ----- ٹھیک۔ میرے لیے کیا
حکم ہے ۔مجھے گھر سے باہر جانے کی
اجازت مل سکتی ہے۔
ارے کیوں۔ کیا ہوا خالد انکل
بھنائے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوئے
میرے بھائی میں گھر پہ بیٹھا آپ کی فون
کال اور چھٹے شعر کا انتظار کر رہا ہوں اور آپ
ہیں کہ ہک، پل فرما رہے ہیں۔ آپ چھٹا
شعر کہیں۔
پھر بات ہوگی۔
فون بند ہو گیا۔
کچھ دنوں کے بعد خالد صاحب ابا سے ملنے
کے لیے گھر آئے۔ میں چائے کا ٹرے
اٹھائے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا
خالد صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے
'کہاں تھے آپ، میں آپ کا انتظار کر رہا تھا'
جی خالد انکل خیریت تو ہے نا۔
ڈرائنگ روم میں نجیب احمد صاحب بھی
موجود تھے۔
'آپ کی میری شاعری کے بارے میں کیا
رائے ہیں۔
ابا اور نجیب صاحب کو دیکھتے ہوئے میں
نے کہا کہ
'آپ باکمال بل کہ بے مثال شاعر ہیں اور
آپ کی شاعری کے حوالے سے نجیب
صاحب اور ابا بھی یہی رائے رکھتے ہیں'
خالد صاحب کہنے لگے
'میں بھی آپ کی شاعری کے حوالے سے
یہی رائے رکھتا ہوں۔ آپ ہی کا انتظار
ہو رہا تھا۔ دراصل مجھے یہ تازہ نظم آپ کو
سنانی تھی۔
اختر حسین جعفری تو آپ سے ملاقات کا
محض ایک بہانہ ہیں'
خالد صاحب نے نظم گا کر سنائی اور خوب داد بھی

سیمی- نظم سنانے کے بعد ابا سے مخاطب ہوئے-
سر مجھے امیر سے بھی نظم سننی ہے-
میں نے جھجکتے ہوئے کہا
'خالد انکل میں آپ کے بعد کیسے اپنا کلام
سنا سکتا ہوں:
کہنے لگے
'ہمارے بعد خدا جانے آپ شاعری کے علاوہ
کیا کچھ کریں گے- آپ بلا تکلف نظم سنائیں'
ایک قہقہہ بلند ہوا میں نے ابا کی موجودگی
کے جھجکتے ہوئے نظم کی پہلی لائن پڑھی تو
کہنے لگے:
نظم کا عنوان کیا ہے
میں نے ڈرتے ڈرتے کہا
'آخری خط کا جواب'
جی ارشاد
دریا کے کناروں سے باہر بھی ایک دریا بہتا ہے
مگر اس دریا میں کوئی کشتی نظر نہیں آتی
اور نہ ہی کوئی بادبان کھلتا ہے
میں نے تمھیں وصل کے لمحے سے باہر بھی
دیکھا ہے، تم سے ملا ہوں
وہ لمحہ جسے عشق کی روایتی زبان میں ہجر
کہتے ہیں
بتاؤ تم نے کتنی راتیں میرے بغیر کاٹیں
اور کتنے دن میرے ساتھ رہتے ہوئے مجھ
سے مل کر میرے بغیر کاٹ دیے
موسم کوئی بھی ہو اُس کی پہچان دھوپ
چھاؤں، ابر و باد، طلوع و غروب سے ہوتی
ہے جبکہ محبت کا کوئی بھی موسم اشک و آہ، نغمہ
و نالہ یا ہجر و وصال کا پابند نہیں ہوتا
بتاؤ تم میرے آخری خط کا جواب کتنے
برسوں کے بعد تحریر کرو گی-

نظم پڑھنے کے بعد میں نے ابا، خالد صاحب اور نجیب صاحب کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا- یہ تینوں حضرات خاموشی سے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے- ان کی خاموش مسکراہٹ کو نہ سمجھتے ہوئے میں ڈرتے ڈرتے خالد صاحب سے مخاطب ہوا-
'خالد انکل آپ کو یہ نظم کیسی لگی؟
کہنے لگے:
'اس نظم پر تو ہم بعد میں بات کریں گے فی الحال تو مجھے آپ کے ابا سے ایک بات کہنی ہے کہ میں بہت فکر مند ہوں نثری نظم کا گھوڑا اگر اختر حسین جعفری کے گھر سے برآمد ہوا تو اس کے پیچھے بہت ماتمی ہوں گے-
ایک قہقہہ بلند ہوا اور موضوع تبدیل ہو گیا-
ابا کے انتقال کے بعد میں اور منظر بھائی کم و بیش روزانہ خالد صاحب اور نجیب احمد صاحب سے ملتے- ۱۹۹۳ء میں باجرہ آنٹی (ہاجرہ مسرور) کراچی سے تشریف لائیں- انھوں نے خالد صاحب سے کہا کہ وہ لاہور کے شعرا اور افسانہ نگاروں سے ملنا چاہتی

ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں خالد صاحب نے ایک نشست کا اہتمام کیا۔ یوسف حسن صاحب راولپنڈی سے اس نشست کے لیے تشریف لائے۔ نشست کے آغاز میں خالد صاحب نے مہمانوں کو ہاجرہ مسرور صاحبہ سے متعارف کروایا۔ مجھے متعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے کہ 'یہ امیر حسین جعفری ہیں۔ آپ کمال ہنرمندی سے بے وزن نظمیں کہتے ہیں' ہاجرہ مسرور کہنے لگیں 'خالد کچھ تو خیال کیا کرو۔ جو منہ میں آئے کہہ دیتے ہو' خالد صاحب کہنے لگے 'جی میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں آپ خود ان سے پوچھ لیجیے کیا یہ نثری نظمیں نہیں کہتے' خالد صاحب کی یہ بات مجھے بہت بری لگی۔ احتجاجاً میں نے اُس نشست میں اپنا کلام سنانے سے بھی انکار کر دیا۔ نشست کے بعد سب شعرا چائے کے لیے لکشمی چوک میں واقع ایک چائے خانے میں جمع ہوئے۔ میری خفگی کو بھانپتے ہوئے یوسف حسن صاحب کہنے لگے کہ 'بھائی آپ کی عمر میں تو انسان رگوں میں خون کی جگہ موسیقی گردش کرتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اس عمر میں نثری نظمیں کہتے ہیں۔ خالد صاحب کہنے لگے آپ خوامخواہ مجھ سے ناراض ہیں آپ جو نظمیں کہہ رہے ہیں ہم احتراماً انھیں نثری نظمیں کہتے ہیں۔ یہ بے وزن نظمیں ہیں۔ میں دلبرداشتہ ہو کر وہاں سے اٹھا اور جاتے ہوئے میں یوسف حسن اور خالد احمد صاحبان سے غصے کے عالم میں کہا کہ آپ دونوں سے بہت جلد ملاقات ہوگی۔ اگلے روز میں اُسی کیفیت میں لکشمی چوک پہنچا تو خالد صاحب حسب معمول اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے مجھے دیکھا تو انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کاغذ جس پہ نظم درج تھی ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ یہی ہوتی ہے بحر یا وزن میں شاعری۔ میں انتہائی غصے کی کیفیت میں تھا خالد صاحب نے میرے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے نظم پڑھنا شروع کی۔ میں مزید کچھ کہے سنے بغیر چائے خانے سے باہر نکل آیا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے نجیب احمد صاحب نے فون کیا اور لکشمی چوک آنے کے لیے کہا۔ میں ان کے حکم کی تعمیل میں الفضل ہوٹل پہنچا تو خالد احمد صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ نجیب صاحب کہنے لگے کچھ نیا لکھا کہ نہیں۔ میں نے کہا جی کل رات ہی ایک نظم ہوئی ہے۔ نظم سن کر نجیب صاحب کہنے لگے یار خالد یہ نظم تو وزن میں ہے۔ خالد احمد صاحب نے نظم سن کر جیب سے دس روپے نکالے اور کہا یہ دس روپے میں تمھیں اس لیے نہیں دے رہا کہ تم نے

اوزان سمجھ لیے ہیں بلکہ اس خوب صورت اور عمدہ نظم کہنے پر دے رہا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ دس روپے میں نے تمھارے والد سے اپنی نظم پر داد کی صورت میں حاصل کیے تھے۔ یہ دس روپے اب تمھارے پاس ایک امانت کی طرح ہیں۔ جس دن تم کسی شاعر یا تخلیق کار کو ان دس روپوں کا صحیح حقدار پاؤ تو اس روایت کو اسی طرح آگے بڑھا دینا۔

میں نے اس مضمون میں اپنی روداد بیان کی ہے۔ اسی طرح کی کہانیاں خالد صاحب کے ساتھ بیٹھنے والے ہر شاعر اور ادیب کے پاس موجود ہیں ۔ عباس تابش، عرفان ستار، علی ارمان، توقیر عباس، بابر جاوید، سبطین رضا، ارشد شاہین، حسنین سحر، کنور امتیاز احمد، جاوید انور، اور ایسے ان گنت نام ہیں جو خالد احمد صاحب سے دوستی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ بالخصوص نجیب احمد اعجاز رضوی اور منظر حسین اختر نہ صرف ان کے دوست تھے بل کہ افرادِ خانہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اور جہاں تک خالد صاحب سے میرے تعلق کی بات ہے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے علم تک نہیں ہوا کہ اختر حسین جعفری کا دوست خالد احمد کب اور کس وقت میرا دوست بن گیا اور دوست بھی ایسا کہ جس کی مثال ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مجھے کبھی کبھی یہ گمان بھی ہوتا کہ خالد صاحب ابا سے زیادہ مجھے دوست رکھتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ خالد احمد کی شخصیت ایسی تھی کہ کی محفل میں بیٹھنے والے ان کے سامنے بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے۔ ان کی ذہانت، قادرالکلامی، شاعری اور زبانِ اردو سے آگاہی کا شہرہ ملک بھر میں تھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انھیں جو مقام، انفرادیت اور اعتبار حاصل تھا ان کے معاصرین اور ہم عمر شعرا کو خال خال ہی حاصل تھا۔ احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری، ضیا جالندھری اور حمید نسیم جیسے شعرا اور نقادوں کی نظر میں خالد احمد اردو شعری روایت کے انتہائی اہم شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گو خالد احمد اپنے مقام و مرتبے کے حوالے سے اس نوع کی گفتگو سے مکمل طور پر آگاہ تھے مگر اس آگاہی کے باوجود وہ اس سے بے نیاز اپنی طرح سے زندگی گذارتے رہے۔ خالد احمد صاحب کی انتقال پر مجھ سے تعزیت کرنے والے بہت سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا وہ بیمار تھے، انھیں کونسی بیماری لاحق تھی، خالد احمد کی موت کس طرح واقع ہوئی میں انھیں جواب میں یہی کہتا ہوں کہ سوال یہ نہیں ہے کہ خالد احمد مرا کیسے سوال تو یہ ہے کہ خالد احمد جیا کیسے۔

☆☆☆☆☆

تخلیقی عمل اور آمد و آورد کا سائنسی، منطقی اور اُلوہی تجزیہ

شاعری، آمد/آورد کے تنازعے سے قطع نظر، الہامی عنصر کی حامل ہوتی ہے، اس پر شاید ہی کوئی شاعر/ناقد معترض ہو، گو کہ جدید ترین طرزِ فکر رکھنے والا طبقہ اسی پہلو کو تشریح و توضیح اپنے انداز میں کرتے رہنے میں حق بجانب ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ تخلیق کی منظم و منظوم ترین شکل یعنی شاعری میں الہامی جہات کی منطقی، عقلی، تاریخی اور سائنسی توجیہہ کن خطوط پر ممکن ہے۔ تاریخی لحاظ سے تو زبانِ پہلوی کے امام مولانا روم کا یہ آفاقی مصرع ہی کافی ہے:

شاعری جزویست از پیغمبری

یہ مصرع بذاتِ خود اپنے اندر جہانِ معنی لیے ہوئے کئی صدیوں سے اتنے پر اعتماد انداز سے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ ہمارے پاس سرِ تسلیم خم کے علاوہ شاید ہی کوئی اور چارہ میسر ہو۔ اب دیکھیے اس کی کیا کیا ممکنہ منطقی توضیحات و توجیہات دستیاب ہیں۔ یہ تو بیشتر اہلِ علم کو معلوم ہوگا کہ وحیِ ربانی کو ایام العرب/جاہلیہ کے قریش جنات کے اثر سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی ضمن میں سیدنا حمزہ کے قبولِ اسلام کے بعد قریش نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو، جب وہ کعبے کے قریب کھڑے تھے، یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو ان پر سے نعوذ باللہ جنات کا اثر ختم کیا جا سکتا ہے۔ سورہ فصلت کی کچھ آیات کی شانِ نزول اسی سے متعلق ہے جب کہ سورہ القلم میں ''انہ لمجنون'' کے الفاظ میں براہِ راست کفار نے یہی بات کی ہے۔

پھر قریش نے ہی یہ تصور کرنا شروع کیا کہ شاید آیاتِ قرآنی شاعری پر مبنی ہیں اور یہ شاعری شاید جنات کراتے ہیں۔ کیونکہ مکی سورہ ہائے مبارکہ کا اسلوب بیشتر شاعرانہ ہونے کے باوجود ایسا تھا جس کی نقل نہ کرنے پر بے بسی سے قریشی شعرا جھلا اٹھتے تھے اور اس کا ثبوت سورۃ الکوثر کی بابت قرآنی چیلنج کا بہت مشہور واقعہ ہے:

افتخار الحق

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ

جس کے جواب کے لیے دس پندرہ دن کی مہلت کے بعد "ماھذا کلام البشر" کی صورت اعترافِ شکست شعرائے قریش میں سے کسی نے کیا تھا، غالباً یہ لبیب نامی شاعر تھے جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا۔

قریش اور قرب و جوار کے بیشتر عرب قبائل کا مزاج جبلی طور پر ہی شاعرانہ تھا اور اس کے کئی شواہد تاریخ کی مستند ترین کتب میں موجود ہیں۔ مثلاً جب رسولِ اکرم طائف تشریف لے گئے اور بنو ثقیف کے سردار عمرو بن امیہ کے تین بیٹوں کو دعوتِ اسلام دی تو ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ (نعوذ باللہ) اگر تو واقعی اللہ نے مبعوث کیا ہے تو میں جا کر سبع معلقات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ کچھ عجب نہیں جو خلیل بن احمد نے ظہور و تکمیلِ اسلام کے کافی عرصہ بعد کعبہ رو ہو کر اللہ سے کوئی منفرد ہنر عطا کرنے کی مقبول دعا کی تھی۔

اسی شاعرانہ جبلت کے تناظر میں حضرت عمر بن خطاب کا دل سورہ طہٰ کی آیاتِ مبارکہ سن کر ہی پگھل گیا تھا کیونکہ انھیں بھی زبردست شاعرانہ ذوق ورثے میں ملا تھا اور متذکرہ سورۂ مبارکہ تقریباً تمام ہی مقفّیٰ رنگ میں نازل ہوئی۔ اسی طرح مدنی حیاتِ مبارکہ کے اختتامی دور میں عام الوفود کے دوران کفار کے ایک وفد کو اپنی قوتِ گفتار پر بے حد گھمنڈ تھا اور اس وفد نے مدینہ میں رسولِ کریم سے مل کر انھیں مفاخرے کا چیلنج کیا۔ مفاخرہ بھی عرب ثقافت کا ایک دلچسپ ورثہ ہے، جس فریقین اپنے اپنے قبیلے / قوم کی فی البدیہہ منظوم تعریف کا مقابلہ کرتے تھے۔ گویا اسے فی البدیہہ قصیدہ گوئی کی ایک صورت سمجھ لیجیے۔ بہرحال اس چیلنج کو شاعرِ رسول جناب حسان بن ثابت اور ان کے رفقا نے نہ صرف قبول کیا بل کہ اس وفد کو شکست بھی دی۔

اس تعارفی پس منظر کے بعد اب ذرا الہام اور وحی کی تفہیم کی طرف آتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں محدِث (دمکسورہ) تو جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں احادیثِ مبارکہ کے عالم و محقق کو کہتے ہیں لیکن محدَث (دمفتوحہ) اس شخص کو کہتے ہیں جس پر وحی نہ اترے لیکن الہام کا نزول ہو اور حضرت عمر کو رسولِ کریم نے خود محدَّث کہا تھا (کافی حوالہ جات میسر ہیں)۔

گویا مولانا روم نے یونہی شاعری کی بابت اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر دیا تھا۔ اسی ضمن میں غالب نے تو خیر جو مصرع کہا تھا وہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

لیکن ساتھ ہی اقبال کا بیشتر کلام، خاص طور پر ان کی شہکار نظم "قرطبہ کی جامع مسجد" خالصتاً اس آمدانہ اور وجد کی کیفیت کے زمرے میں آتی ہے جو صدیوں بعد مسجدِ قرطبہ کا مقفل دروازہ کھول کر علامہ پر طاری ہوئی تھی۔ علامہ نے کسی مذاکرے میں وحی کی بابت پوچھے گئے سوال کے جواب میں یہی کہا تھا کہ ان کے پاس وحیِ الٰہی کے دفاع میں سب سے بڑا ثبوت ان کی شاعری ہے جو ان کے مطابق خالصتاً وجدانی کیفیت کا ثمر تھی۔ ممکن ہے ایسی کیفیات کا دفاع کرتے ہوئے ہی علامہ نے جارحانہ انداز میں شعر کہا تھا:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

....

عربی ادب اور اس سے جڑی دینی تناظر پر مبنی تصریحات کے بعد اس موضوع کی سائنسی جہت کی طرف آتے ہیں۔ تخلیقی عمل خاصا پیچیدہ ہے اور اس پر جملہ طبی/ میڈیکل سائنس سے وابستہ محققین کا اجماع بھی ہے کہ تاحال انسانی دماغ کی ساخت تو تقریباً مکمل سمجھ آ چکی ہے لیکن اس کے افعال لگ بھگ بیس فیصد کے قریب ہی حضرتِ انسان کو سمجھ آئے ہیں۔ یہاں ذرا سائنس اور اُلوہیت کا امتزاج دیکھتے ہیں۔ تخلیقِ آدم کے بعد رب کائنات کے کہے گئے "وعلم آدم الاسما" کے الفاظ بظاہر جتنے سادہ ہیں، ان کی گہرائی میں اتریں تو ایک پورا جہانِ معنی آباد نظر آئے گا۔ (یہاں میں عربی قواعد تک محدود رہوں گا کیونکہ مسلکی تعبیروں میں پڑنے سے اندیشہ ہے کہ موضوع سے انحراف نہ ہو جائے)۔ آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں انسان کو "علمِ اسما" / Nomenclature ودیعت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ انسان کب نئے نام رکھتا ہے؟ صرف تب جب وہ کچھ دریافت یا ایجاد کرے۔ ظاہر ہے اس کے لیے قدرت نے انسانی دماغ کی ساخت و افعال کو دیگر مخلوقات سے مختلف/ برتر ہی رکھا تھا۔ سو اب تک کی دریافت کے مطابق انسانی دماغ کے کچھ مخصوص خلیے/ نیوران ایسے ہیں جنھیں تحریک دیتے ہی وہ یکدم پراسرار طور پر فعال ہو جاتے ہیں۔ طب جدید کی اگلی منزل یہی ہے کہ اس فعالیت کی زبان پر پڑا پردہ ہٹایا جائے / decoding functions cerebral تاکہ انسان کے خالق کا ایک اور زیادہ واشگاف دعویٰ "علّمہ البیان" کی معنوی گہرائی میں جھانکنا ممکن ہو سکے۔

اس تمام تفصیل کا مدعا یہی ہے کہ شاعرانہ آمد کو نہ تو یکسر مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے کلیتاً ہی شعری تخلیق کا واحد عامل قرار دیا جانا جائز ہوگا۔ یہ عین ممکن ہے کہ جس جس دور میں انسان کا اپنے ماحول کی جزئیات سے بہت تفصیلی تعامل نہیں ہوا کرتا تھا تو اس دور کے شعرا پر آمد کی کیفیت نسبتاً زیادہ ہوا کرتی ہو اور اس کی سب سے بڑی دلیل وہ شعرا ہیں جنھیں عروض کی رسمی تعلیم میسر نہ تھی لیکن ایک فطری آہنگ ان سے موزوں شعر کہلوا لیا کرتا تھا۔ اگر مزید سائنسی اصطلاحات سے اس موضوع کا احاطہ کیا جائے تو انسانی جسمانی نظام و افعال کو ایک طرف انتہائی پیچیدہ اعصابی نظام چلاتا ہے، جس کا مرکز دماغ ہے، جب کہ دوسری جانب اسی کے متوازی ایک ہارمونی نظام بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ہارمونی نظام اول الذکر نظام کی نسبت کافی کم پیچیدہ لیکن خاصا دلچسپ ہے۔ پھر یہ اہم حقیقت بھی دھیان میں رہنی چاہیے کہ دل اور دماغ دونوں میں باقاعدہ معمولی مقدار کی برقی رو/ الیکٹرک کرنٹ ان اعضا کی کارکردگی میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہے۔ اس بابت ایک بہت معنی خیز مشاہدہ یہ ہے کہ ایک طرف مرگی کے مریضوں اور دوسری طرف نابغۂ روزگار یعنی جینیس / Genius افراد کے دماغ کی برقی رو کی شدت عام انسانوں کے مقابلے میں کافی تیز ہوتی ہے لیکن دونوں میں اس کا اظہار متضاد صورتوں میں ہوتا ہے۔ بالفاظ دگر عصبی خلیوں کے ساتھ برقی رو بھی تخلیقی عمل میں ملوث پائی گئی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اردو اور انگریزی روزمرہ اور محاوروں نے برقی رو پر تحقیق میں بالواسطہ کوئی کردار ادا کیا ہو، جیسے "یہ خیال میرے ذہن میں برقی کوندے کی طرح لپکا۔" / An idea flashed into my mind کم از کم مجھے تو اس برقی رو اور اس سے وابستہ محاوراتی جملوں کے پس پردہ موجود آمد کی کیفیت کے حق میں دلائل دکھائی دے رہے ہیں۔

ان تمام دلائل و حقائق کو یک جا کر کے وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو خلاقیت کو دماغ کے وہ خلیات جو تخلیقی عمل سرانجام دیتے ہیں، ان میں برقی رو اور کچھ اور معلوم / نامعلوم عوامل کوئی پراسرار کیمیائی عمل شروع کرتے ہیں جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ:

تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

....

کا ماحول تشکیل پانے لگتا ہے۔ سو یہ تو طے پا گیا کہ تخلیق کی آمدانہ صورت کی باقاعدہ توجیہ و توضیح الوہی اور سائنسی زاویوں سے

ممکن ہے جسے اب تک کی گئی تحقیق کے مطابق رد کرنا خاصا محال ہے۔

جب انسانی دماغ میں یہ تمام منظرنامہ تشکیل پا جائے تو ایک خلاق ذہن کو مناسب اور سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ماحول جو پیہم تخلیقی عمل کو تحریک دینے کا کارِ خیر کرے تاکہ شاعر کچھ شہکار اصنافِ سخن سے ادب کا دامن بھرتا رہے۔

اگر میر، غالب اور ان کے معاصر و متاخر شعرا کا سوانحی جائزہ لیا جائے تو ایک زوال آمادہ حکومت اور معاشرت اس تحریک کا سامان بہم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بس میر اور غالب کا اس مائل بہ انحطاط تاریخی دور میں شعری ردِعمل اپنے اپنے انداز کا ہے۔ میر کا اظہار اداسی کے پیرہن میں ملبوس ہے:

یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت نہیں ہمیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں

....

اس کے برعکس غالب نے غم و اندوہ سے بوجھل فضا کے سامنے سینۂ سخن کچھ یوں تانا:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

....

اردو کے تیسرے عظیم شاعر اقبال نے مسلم سیاسی و سماجی زوال سے پیدا شدہ صورت حال کے زمانے میں پرورش پائی اور انھوں نے صرف مسائل کو موضوعِ سخن بنانے پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے تئیں اس کے مناسب تدارک اور مسلم نشاۃِ ثانیہ کی بات بھی کی اور ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ اقبال نے مغربی ماحول میں رہ کر مشرق و مغرب کا تقابلی مطالعہ کیا تاکہ سامراجی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا پوری طرح ادراک کر کے امتِ مسلمہ کو جھنجھوڑ کر اسے احساس دلایا جائے کہ:

"تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

....

یوں ہم جبلی شعرگوئی اور اسے صیقل کرنے والے ماحول کے تعلق کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہی منطقی وضاحت ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ وجدانی / الہامی / آمدانہ کیفیت کی قوت اور اس کے لیے عمل انگیز / catalyst کا کردار ادا کرنے والے ماحولیاتی عوامل و عناصر کے مابین ایک مخصوص تناسب ہی ایک بڑے شاعر سے سخن کے شہ پارے تخلیق کروانے کا مقدس فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس مرکزی نکتے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی التوا latent interval of creativity یا اس سے بھی بڑھ کر تخلیقی بانجھ پن / inactive creativity کا بڑا سبب اسی تناسب

میں خلل یا ضعف ہو سکتا ہے۔

ان تمام نکات سے ایک نتیجہ تو اخذ کیا جا سکتا ہے جس پر میرے خیال میں اس موضوع پر کام کرنے والے کم و بیش تمام ماہرین کا اجماع ممکن ہے اور جسے میرزا رفیع سودا نے اپنے مخصوص طنزیہ رنگ میں یوں بیان کیا ہے:

طبیعت سے فرومایہ کے شعرِ تر نہیں ہوتا

....

یہاں ''فرومایہ'' سے مراد وہ شخص ہے جس کے ذہن کی مٹی میں وہ تخلیقی معدنیات یا اجزا نہیں ہوتے جو شاعری کے بیج کی نمو کرتے ہیں۔ بالفاظِ دگر ممکن ہے ایسے شخص کو قدرت نے تخلیقی اظہار کے دیگر جوہر، جیسے نثر نگاری یا ادب کے علاوہ سماجی یا طبعی علوم کے کسی اور شعبہ میں نام کمانے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہو۔

کچھ غور کیا جائے تو یہی نکتہ ہمیں آورد کے منطقۂ فکر میں لے جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک شخص طبعِ موزوں یا شاعری کے لیے فطری میلان کے ساتھ پیدا ہوا ہو تو اسے بس ایک محرکانہ ماحول یا واقعہ یا حادثہ کی طلب ہوتی ہے جس کے بعد ایک اختراعی دماغ کے ارفع خلیات / **Higher centres of brain** میں کسی خودکار میکانکی نظام کے تحت سلسلۂ سخن وری چل پڑتا ہے۔ یہاں ہم اس موڑ پر آ پہنچے ہیں جہاں ماحول سے تعامل کا تذکرہ ناگزیر سا ہونے لگتا ہے۔ جبلی صلاحیت اور تحریک انگیز ماحول: ان کے مابین ایک خاص تناسب ملتے ہی عمدہ اور معیاری شاعری کا ورود ہونے کے امکانات ازخود بڑھتے چلے جاتے ہیں اور:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

....

کی متعدد تعبیریں ہمارے دائرۂ فہم کا رخ کرتی ہیں۔ وہ ناقدین و محققین جو آمد کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ بناتے ہیں، ان کے نزدیک ممکن ہے شاعری سمیت تمام تخلیقی سرگرمیوں کی کوئی توجیہہ موجود ہو لیکن شاید اس پر بہت زیادہ کام کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ میرے محدود علم میں ایسے کچھ شعرا اور ان کے نکتہ ہائے نظر ہیں تو سہی لیکن دیانتداری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے پیش کردہ دلائل نے مجھے کوئی خاص متاثر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ میرے نزدیک طبعِ موزوں یکسر عنقا ہونے کی صورت میں شاعری کی کوشش جبری بھرتی یا جبری مشقت کے مترادف ہوگی۔ ایسے احباب شاعری میں نئے تجربات کا ہتھوڑا مسلمہ اصنافِ سخن پر چلاتے رہتے ہیں اور اس ضمن

میں ان کا خاص ہدف غزل ہوتی ہے لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ غزل کی صدیوں سے چلی آئی خوب صورت ہیئت کسی نہایت مضبوط اندرونی دفاعی نظام / inbuilt defence mechanism کی مدد سے کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس نظم میں موجود لچک اور اس کا وسیع تر کینوس نظمِ معرّیٰ سے لے کر نثری نظم تک کے تمام رنگوں کو خود پر بکھرنے دیتا ہے۔ بہر حال شعبۂ سخن کی کوئی بھی صنف ہو، اس کا اسلوب اور بنت بتا دیتے ہیں کہ جبری بھرتی کی ذیل میں حشو و زوائد، نامانوس الفاظ و تراکیب اور صدیوں سے برتے ہوئے مضامین کو کھینچ تان کر برتنے والی کاوش کے پیچھے کس قبیل کا ذہن کارفرما ہے۔ وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور با سانی شعر کہنا واقعی "چیزے دیگری است" ہے، جب کہ مطالعے اور مشاہدے کی مثبت عادت اپنانے کے بعد شعر کہنے کے لیے پیہم ایسی سعیِ بسیار کرنا جس کے نتیجے میں عمومی معیار کی شاعری وجود میں آئے، کچھ اور معاملہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آورد کے حامی معزز شعرا بھی اس بات کے قائل ہوں گے کہ شعر گوئی کا خام مال اعلیٰ درجے کا ہو گا تو اسی صورت میں معیاری شاعری کی کاوش بار آور ہو گی۔

آخر میں ایک اہم بات اور بھی کرنا ضروری ہے۔ وہ شعرا جن میں شعر گوئی کی فطری صلاحیت ہوتی ہے، ان میں بھی دیکھا گیا ہے کہ غزل یا نظم کی کچھ اشعار/مصرعے کہنے کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کئی دنوں بل کہ ہفتوں تک تخلیق مکمل نہیں ہوتی اور وہ دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کم معیار کا مال بازارِ سخن میں لانے کے بجائے صبر و استقامت سے اس لمحۂ خاص یا لمحۂ یوریکا کے منتظر رہتے ہیں جب گویا کسی طلسمی قوت سے ان کی تخلیق اپنی تکمیل کی طرف دوبارہ گام زن ہوتی ہے۔ اس طرح کی صورتِ کاروائی میں آمد و آورد کی ایک امتزاجی شاہراہ سی تعمیر ہونے لگتی ہے، جس پر سفر کرنے کے لیے شاعر کو تحمل کی اضافی لیکن ناگزیر صعوبت سہنا پڑتی ہے۔

رہی بات تخلیقی اماوس کی تو یہ قطعی طور پر فطری اور نارمل سلسلہ ہے۔ شاید قدرت شاعر کے لیے آرام کا اہتمام کرتی ہے تاکہ وہ تازہ دم ہو کر اپنی شناخت برقرار رکھنے کے قابل ہو سکے۔ فراز اور فیض کے مابین ایک مکالمے میں شاید فیض نے اسی صورتِ توقف کی بابت کہا تھا کہ وہ ایسے میں تراجم پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یارسولؐ اللہ آپ کی عمر مبارک کے ہر پل پر سلام

حضورؐ کی محبت ایسا جذبہ ہے کہ میرے جیسا بندہ بھی ترجمانی کرے تو اس سے سچی عقیدت ہو جاتی ہے مگر میں اس سچی عقیدت کا رُخ بھی سچی ذات کی جانب موڑنا چاہوں گا جو حقیقی حقدار ہیں۔ ادب محمدؐ کے ایمان افروز اعمال کرنے والوں میں سے ایک نام محمود غزنوی کا بھی ہے اس تخت نشین غلام محمدؐ کے پاس ایران کا سفیر بیٹھا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنے خادم کو آواز دی۔۔ حسن۔۔ اور حسن پانی کا لوٹا لے کر آ گیا۔ محمود غزنوی نے لوٹا پکڑا اور وضو کرنے چلے گئے ایرانی سفیر نے حسن سے سوال کیا کہ محمود غزنوی نے تو آپ کو فقط آواز دی اور آپ پانی لے کر آ گئے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ محمود کو پانی کی حاجت ہے؟ حسن نے جواب دیا کہ میرا پورا نام محمد حسن ہے اور محمود غزنوی فقط حسن کے نام سے مجھے تبھی بلاتے ہیں جب ان کا وضو نہیں ہوتا کیونکہ انھوں نے محمدؐ نام کبھی بغیر وضو کے نہیں لیا۔

اسی ادب کو حضرت فخر الدین سیالویؒ اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

باب جبریل کے پہلو میں ذرا دھیرے سے
فخر جبریل کو یوں کہتے ہوئے پایا گیا
اپنی پلکوں سے در یار پہ دستک دینا
اُونچی آواز ہوئی تو عمر کا سرمایہ گیا

ہر مسلمان کے لیے اسم اعظم درود پاک ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں میرے سب سے زیادہ قریب وہ ہو گا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پاک بھیجے گا اور حضور نبی کریمؐ کے سب سے زیادہ قریب تو خود خدا ہے جو فرماتا ہے میں اور میرے فرشتے ہر وقت محمدؐ پہ درود بھیجتے ہیں اے ایمان والوں تم بھی اُنؐ پہ درود بھیجو۔

عقل حیرت کی وادیوں میں بھٹکنے لگتی ہے جب سوچتا ہوں کہ خدا کسی کام میں اپنی کسی مخلوق کو شریک نہیں ٹھہراتا مگر درود پاک میں شرکت کی خود دعوت دے رہا ہے۔ جو درود ہم بھیجتے ہیں اسے پہلے خود خدا سنتا ہے اور ہماری کمی بیشی کو دُور فرما کر اپنے حبیبؐ کی شان کے مطابق بنا کر بارگاہ محمدؐ میں روانہ فرماتا ہے اور ساتھ میں اس درود پاک کی وجہ سے ہمارے اوپر رحمتوں کے درجات بلند کرتا رہتا ہے۔

مجھے تو لگتا ہے درود والی زبانوں کی رُوحوں پر فیض کے ہر لمحہ بڑھتے اضافے کا عمل ہی خدا کا درود ہے۔

تخلیق کائنات سے پہلے وجہ تخلیق کائنات کا نور پیدا فرما کر اپنے قرب خاص میں رکھنے والا خدا

ظفر اقبال ظفر

جب قیامت قائم کر کے سب کچھ صفحہ ہستی سے مٹا دے گا تب بھی نورِ محمدؐ موجود ہوگا اور رب اس پہ درود پڑھتا رہے گا۔ اپنے محبوب کی جدائی سے لمحہ بھر کو بھی محروم نہ ہونے والے رب سے جب موسیٰؑ نے پوچھا کہ اے رب تیرے قریب ہونے کا خاص طریقہ کیا ہے؟ تو رب نے فرمایا میرے محبوب پہ درود پڑھا کرو۔

حضرت شیخ محی الدین المعروف ابن العربیؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ سپین کے شہر اشبیلیا میں ایک لوہار رہتا تھا جو چھریاں تلواریں نیزے سمیت لوہے کی اشیاء کا کام کرتا تھا جو کسی سے گفتگو نہیں کرتا تھا بلکہ گاہک کا سوال سن کے جواب میں کہتا۔ اللھم صلی علی محمد۔ جاننے اور بتانے میں وہ فقط یہی کلمات۔ اللھم صلی علی محمد۔ کا استعمال کرتا ہر وقت باوضو رہ کر اپنی زبان کو اللھم صلی علی محمد کی قید میں رکھنے والے اس لوہار کا نام ہی۔ اللھم صلی علی محمد۔ پڑ گیا۔ فتوحات مکیہ جیسی کتاب لکھنے والے شیخ محی الدین ابن العربیؒ کہتے ہیں کہ مجھے جب کبھی مشکل پیش آتی تو میں اس لوہار سے دُعا کرواتا جو فوری قبول ہو جاتی۔ زمین و آسمان کے خدائی علوم سے پردہ اُٹھانے والے شیخ ابن العربیؒ اللھم صلی علی محمد کے وظیفے سے تر رہنے والی زبان کے لوہار کے خدائی مقام کی شہادت دے رہے ہیں۔

کلر کہار کے قریب خوش حال کلاں گاؤں کے نوجوان کرشن لال جو ہندو تھے اور ان کو خواب میں آ کر خود حضورؐ نے کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا تھا ان کا نام غازی احمد رکھا گیا۔ پروفیسر احمد غازی لاتعداد درود پاک کا تحفہ بارگاہ محمدؐ میں روانہ کرتے تھے وہ اپنی تنخواہ اپنے طالب علموں پر خرچ کر دیتے تھے سفر کے اخراجات سے محروم اس عاشق رسولؐ کو اپنے در پر حاضری کروانے کے لیے رسولؐ پاک نے دبئی کے ایک امیر شیخ کے خواب میں تشریف لا کر حکم دیا کہ پروفیسر احمد غازی نے درود پاک کی کثرت مثل بارش کر دی ہے۔ اس کا پتہ دے کر فرمایا کہ اس کے پاس جا کر اسے ہمارے روضے پر لانے کے انتظامات کرو۔

درود پاک وہ اسم اعظم ہے جو مسلمانوں کا دفاع بھی ہے اور طاقت بھی۔ رب نے ایک فرشتے کی ذمہ داری لگا رکھی ہے جو قیامت تک زمین کے جس حصے پر بھی کوئی درود پاک پڑھے گا وہ بارگاہ محبوبؐ میں پہنچاتا ہے۔ مگر اہلِ محبت کا درود پاک حضورؐ پاک خود سماعت فرماتے ہیں یہ اہلِ محبت وہ خوش نصیب ہیں جو درود پاک کی کثرت بڑھاتے بڑھاتے اس قدر توجہ رسولؐ پاک حاصل کر لیتے ہیں کہ حضورؐ ان کا نام اپنے رجسٹر میں درج فرما لیتے ہیں۔

گجرات کے خواجہ گوہر الدینؒ نے کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ نہیں لیا مگر درود پاک کی وجہ سے نگاہ مصطفیٰؐ سے علم لدنی کے ایسے درجے پر فائز ہوئے کہ آپ کے دور کے بڑے

بڑے پیر عالم آپ سے اسلامی مسائل کی اصلاح لیتے تھے آپ نے کتب کی وسیع لائبریری بنائی ہوئی تھی جب کوئی پوچھنے آتا آپ فرماتے میں تو کھیتوں میں ہل چلانے والا جاہل ہوں آپ کتابوں کی الماری میں فلاں جگہ پڑی فلاں کتاب کے اس صفحہ نمبر پر توجہ کریں آپ کو حل مل جائے گا۔ ایک دن ایک بڑی علمی شخصیت نے آپ کا امتحان لینے کے لیے حدیث کی کتاب کے ایک صفحے کی عبارت چھپا کر غلط عبارت تحریر کر کے آپ کے سامنے رکھی اور اس کے بارے میں پوچھا تو آپ کچھ وقت کے لیے آنکھیں بند کر کے خاموشی کی حالت میں چلے گئے پھر واپس پہلی حالت میں آکر سوال کرنے والے سے کہا کہ یہ حضورؐ کا فرمان نہیں یہ جھوٹ ہے۔ تو سوالی عالم نے کہا کہ آپ شروع میں ہی یہ بتا دیتے آنکھیں بند کر کے اتنا وقت لگانے کی کیا وجہ تھی؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں حضورؐ کی بارگاہ میں جا کر دریافت کر رہا تھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرا فرمان نہیں ہے مولوی جھوٹ لایا ہے۔

درود پاک روحانی پرواز دے کر حضورؐ سے براہ راست تعلق کی بنیاد رکھواتا ہے۔ مولانا جلال الدین سیوطیؒ کے مقدروں پہ قربان جاؤں حالت بیداری میں حضورؐ سے ملاقاتوں کا شرف رکھتے تھے حضورؐ نے انھیں خود شیخ الحدیث کا خطاب دیا وہ فرماتے ہیں مجھے جب کسی چیز کی سمجھ نہیں آتی تھی تو میں حضورؐ سے پوچھ کر درج کیا کرتا تھا۔

صوفی محمد افضل فقیر نگاہ مصطفیؐ کے حامل وہ خوش نصیب تھے جنھیں کثرت درود پاک کی وجہ سے تہہ لرز کا مقام حاصل تھا جس کی بدولت وہ لمحوں میں زمین کے کسی بھی مقام پر پہنچ جاتے تھے۔

حضورؐ اپنی ظاہری حیات میں جس طرح اپنے صحابہؓ اکرام کو نوازتے تھے وہ سلسلہ سخاوت روز حشر تک جاری و ساری رہے گا۔ ہر عبادت درود پاک کے پروں سے ہی آسمانی پرواز کرتی ہے۔ قرب مصطفیؐ ہی قرب خدا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دور میں ایک شخص نے دو سو سال رب کی نافرمانی کی اپنے گناہوں کی کثرت کی بدولت قابل نفرت ٹھہر چکا تھا جب مرا تو لوگوں نے گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ نے وحی بھیجی کہ جاؤ میرے دوست کو غسل دو کفن دو تدفین کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے عالم حیرت میں رب سے سوال کیا یہ آپ کا دوست کیسے بنا؟ تو رب نے فرمایا کہ جب یہ انجیل پڑھا کرتا تھا تو جہاں میرے محمدؐ کا نام آتا یہ اُسے چوما کرتا تھا۔

احسانی کیفیت میں درود پاک پڑھیں کہ اس کیفیت میں یہ عالم ہوتا ہے کہ حضورؐ پر درود پاک ایسے پڑھو کہ تم حضورؐ کو دیکھ رہے ہو یا اس یقین میں پڑھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ بارگاہ خداوندی میں محبت رسولؐ کے بغیر کوئی عبادت قبول نہیں عبادت تو عبادت وجود مومن ہی قبول نہیں۔

☆☆☆☆☆

گفتگو کا چراغ [استادِ گرامی ڈاکٹر اسلم انصاری: مختصر تعارف]

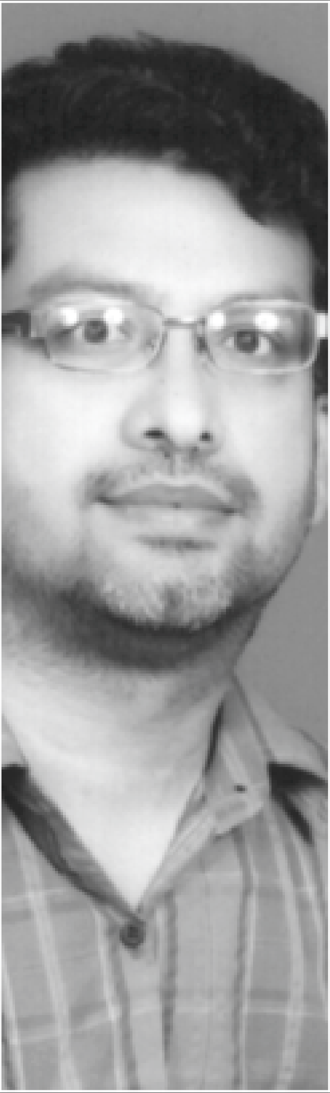

محمد افتخار شفیع

بہار رخصت ہو چکی تھی، آم کے درختوں پر کوئل کی نغمہ سرائی کا موسم آنے والا تھا، پیرانہ سالی کے دکھوں کی ماری فصیلِ شہر خود کو نئے سرے سے موسم کی شدتوں کو سہنے کے لیے تیار کر رہی تھی، بہاء الدین زکریا رحمہ اللہ علیہ کے روضے کی جالیوں سے جھانکتی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا۔ اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک روپہلے اور خوش گوار دن میں ملتان کے قدیم علاقے پاک گیٹ کی ایک حویلی میں حاجی قاسم علی انصاری کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا، نومولود کا نام اسلم رکھا گیا۔ یہی اسلم بعد میں ادبی حلقوں میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام معروف ہوا۔ انصاری صاحب کے اجداد ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ جس مکان میں بچپن گزرا وہ گرد و نواح کے علاقے میں پھولوں والی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ خبر نہیں ریاست لوہارو کی اونچی مٹی والی حویلیوں کی طرح اس پھولوں والی حویلی کے صحن میں پھولوں سے لدے پودوں پر پنکھا جھلنے کا رواج تھا کہ نہیں البتہ یہ طے ہے کہ گھر کے مکیں گہری نیند کے جلو میں معطر خواب دیکھیں یا کتابوں کے لازوال خزانے سے

اپنی باتوں کو خوشبو سے آراستہ کریں۔ ان کی نفاستیں ضرور مثال بنتی ہیں۔ اسلم انصاری کہتے ہیں: میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میرا گھر ہر قسم کی علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں سے اٹا ٹوٹ بھرا پڑا تھا۔ لیکن جس پہلی کتاب کو بغیر استاد کی مدد کے خود بہ خود پڑھنا شروع کیا وہ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی شائع کردہ داستان امیر حمزہ کی ایک دل چسپ تلخیص تھی جو ابوالاحفیظ جالندھری کے زور قلم کا نتیجہ تھی (۱)۔

اسلم انصاری نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ایمرسن کالج ملتان سے ایف۔اے اور ۱۹۵۹ء میں اسی تاریخی درس گاہ سے بی۔اے (آنرز) کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش انھیں لاہور کھینچ لائی، آغاز میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی کے طالب علم کی حیثیت سے ایف۔سی کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی چلے آئے، یہاں ایم۔اے اردو کے دوران میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سجاد باقر رضوی جیسے اساتذہ غیر معمولی ذہانت، وسعت مطالعہ اور ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنے شاگرد خاص کا درجہ دیا۔ بہ قول ڈاکٹر خورشید رضوی:

اس وقت کے پرنسپل اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبداللہ اپنے علمی اور تنقیدی مضامین کچی پنسل سے لکھا کرتے تھے اور پھر مختلف نشانوں سے مربوط کرتے ہوئے، بین السطور اور حاشیوں پر پیچ وخم عبارتوں کا اضافہ کرتے چلے جاتے تھے۔ ان مضامین کی عبارتوں اور اضافوں کے ربط ضبط کو سمجھ کر سید صاحب کے حسب منشا انھیں صاف کر کے لکھ دینا عام کے کسی طالب علم کے لیے ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ یہ کام اسلم انصاری کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے موتیوں سے جڑے سواد خط میں اس خوبی سے ان مضامین کی تبیض کر دیا کرتے تھے کہ سید صاحب کا جی خوش ہو جاتا تھا۔ (۲)

اورینٹل کالج لاہور میں اسلم انصاری وولنر ہاسٹل میں قیام پذیر رہے۔ انھی دنوں میں ان کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی، یہ رسم راہ جلد دوستی میں بدل گئی، ناصر کاظمی کے مجموعہ کلام پہلی بارش کا عنوان اسلم انصاری کا تجویز کردہ ہے۔ اس مجموعے کی مسلسل غزلیں بھی ناصر کاظمی نے نوجوان اسلم انصاری سے متاثر ہو کر کہیں۔ ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کے امتحان میں اسلم انصاری نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہاں بہ طور لیکچرار کے تدریسی امور انجام دیے، اس دوران انھوں نے پی۔سی۔ایس کا امتحان

پاس کرلیا لیکن تقرر نہ ہوسکا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے انھیں لیکچرار شعبہ اردو منتخب کیا گیا۔ اس دوران میں وہ گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ اور گورنمنٹ کالج بھکر میں متعین کیے گئے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ ملتان آرٹس کونسل کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بن گئے، ۱۹۷۶ء میں ان کی بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ایمرسن کالج ملتان بھیج دیا گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ اسی کالج میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اردو زبان و ادب میں بہ امتیاز ایم - فل اور پھر پی - ایچ - ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد کچھ وقت سرائیکی ریسرچ مرکز میں بھی گزرا۔ ۲۰۰۹ء میں اسلم انصاری کی علمی و ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے انھیں تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔ ان کی دل چسپی کا وسیع میدان ہے۔ انھوں نے شاعری، تنقید و تحقیق، ترجمہ نگاری اور اقبالیات کے شعبے میں تخصص حاصل کیا۔ نئی نسل کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان کے اہم شاگردوں میں خالد مسعود خان، سید ذوالکفل بخاری، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، ڈاکٹر جاوید اصغر اور (بہ زعم خود) فقیر افتخار شفیع شامل ہیں۔ ملتان میں مقیم اسلم انصاری کی علمی حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی منظرعام پر آنے والی چند کتابیں یہ ہیں:

۱- kafeez کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کی منتخب سرائیکی کافیوں کا اردو ترجمہ (بہ اشتراک جیلانی کامران)
۲- خواب و آگہی (شعری مجموعہ)
۳- اقبال عہد آفریں (اقبالیات)
۴- نقش عہد وصال کا (شعری مجموعہ)
۵- فیضان اقبال (منظوم اقبالیات)
۶- چراغ لالہ (فارسی مثنوی)
7- Lotus and the sand waves (Poems and Plays)
۸- شعر و فکر اقبال (اقبالیات)
۹- تکلمات (علمی، ادبی اور تہذیبی کالم)
۱۰- بیڑی وچ دریا (سرائیکی ناول)
۱۱- نگار خاطر (فارسی مثنوی)
۱۲- ادبیات عالم میں سیرِ افلاک کی روایت (تنقیدی مضامین)
۱۳- اردو شاعری میں المیہ تصورات: مقالہ پی- ایچ- ڈی (تنقید و تحقیق)
۱۴- چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی: سوانح اور فکری و فنی جائزہ (تنقید و تحقیق)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شاعری کا آغاز دور طالب علمی سے ہوا، اورینٹل کالج میں

دوران تعلیم وہ مختلف مشاعروں میں شرکت کرتے رہے، ان دنوں کی ایک خوش کن یاد شمع تاثیر مشاعرہ میں انور مسعود کے ساتھ اورینٹل کالج کی نمائندگی کرنا تھا۔ اس مقابلے میں انور مسعود نے نظم اور اسلم انصاری نے غزل کے مقابلے میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ اسلم انصاری کی اس غزل کا ایک شعر دیکھیں:

شرار زندگی بھی کیا چراغ زیر داماں ہے
بہاروں میں بھی گل شعلہ بجاں معلوم ہوتے ہیں

....

اسلم انصاری نے غزل کی صنف کو شاید ساٹھ کی دہائی میں بہ طور شاعر قبول کیا۔ ان دنوں ہر طرف نظم کا شہرہ تھا۔ اسلم انصاری نے چڑھتے سورج کو سلامی دینے کے بجائے وقتی دھندلکوں کو قبول کیا۔ اسلم انصاری نے اردو اور فارسی غزل کہتے ہوئے کسی وقتی میلان کو قبول نہیں کیا۔ ان کا شمار قدیم وجدید کے رجحانات کا اتصال کرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غزل کا نیا طرز احساس زندگی کے مہذب اور سلجھے ہوئے انداز کا رچاؤ بھی نمایاں ہے۔ اسی الگ تشخص کی وجہ سے راہ ومنزل کا شعور آغاز ہی سے ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ عدمیت وہستی کے تصور سے آشنا ہیں، اور ان کا یہ احساس تیسری دنیا کے مسائل ومعاملات سے لے کر خود ان کے داخلی کرب تک پھیلا ہوا ہے۔ آگہی کے تجربات سے آشنا ہونے کے باوجود خوابوں کی فسوں کاری کے تجربات ان کے ہاں ایک نامیاتی کل بن جاتے ہیں۔ نمونے کے چند اشعار دیکھیں:

وہ ملا تھا سر راہے پہ بہت لوگ تھے ساتھ
آج کی شام تو وہ شخص اکیلا ہوتا

عدم کی سمت سے سوئے وجود آتا ہوا
نیا جہاں ہو کوئی چشم دور بیں کے لیے

ہم بھی چند کھڑکیوں سے خواب چرا سکتے تھے
ہم بھی اس شہر کے کچھ چیدہ مکاں جانتے ہیں

....

اردو زبان وادب کے ایک استاد کی حیثیت سے اسلم انصاری نے لفظوں کی خوشبو کو قائم رکھا ہے۔ ان کی نظموں میں فلسفیانہ تشکیک اور کرید محض واقعاتی نہیں بل کہ اس کو برصغیر کے ہندالمانی کلچر کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، وہ ایک طرف تو میرا جی، ن۔ م۔ راشد اور مجید امجد کے سلسلے کے شاعر ہیں دوسری سمت سے ان پر بیدل عظیم آبادی اور علامہ محمد اقبال کے واضح اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انصاری صاحب کی نظمیں ان کی غزل کا تکملہ یا منظوم حاشیہ نہیں۔ اقبال کے وسیلے سے تو ایک الوہی انا کی جھلک بھی اس شاعری کے بطن میں

دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک نظم تمام دکھ ہے میں گوتم بدھ کے ذریعے سے شاعر نے اپنا فلسفہ حیات پیش کیا ہے۔ سدھارتھ مشرق کی اہم ترین شخصیات میں شامل ہے۔ اس نظم کا خطاب عام لوگوں سے نہیں بل کہ الم آفریں تکلم سے من کی دنیا کو روشن کرنے والی نسل سے ہے۔ شاعر زندگی کی دکھ بھری حقیقتوں کو بہ تفصیل بیان کرنے کے بعد گوتم کے ابد گیر لہجے میں زندگی کے اس راز کو یوں فاش کرتا ہے۔ یہاں شاعری کا انداز دیکھیں:

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے۔ ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے
ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق یہ اہتمام
دکھ ہے
سکوت دکھ ہے کہ اس کے کرب عظیم کو کون
سہہ سکا ہے
کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو
ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے
دوام دکھ ہے
مرے عزیزو! تمام دکھ ہے

....

اردو میں رباعیات معریٰ کا تجربہ اسلم انصاری کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ فارسی شاعری میں اسلم انصاری نے مختلف اصناف میں سخن گوئی کی ہے۔ عالمی ادب میں شعرا کے فکری و تخیلی سفر کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ورجل کی منظوم داستان انیڈ، واقعہ معراج و اسریٰ، ابو العلا المعری کے رسالہ الغفران، شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف فتوحات مکیہ، عبد الکریم الجیلی کی الانسان الکامل، محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال، سجاد انصاری کے غیر مکمل ڈرامے روز جزا اور علامہ محمد اقبال کی جاوید نامہ جیسی کتابوں نے ایک خاص روایت کی بنیاد رکھی ہے۔ اسلم انصاری کے ہاں اسی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں سیر افلاک کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غزل میں فارسی کے اساتذہ کا خاص رنگ نمایاں ہے:

ایک جگہ مکالماتی انداز کی ایک فارسی غزل کے اشعار دیکھیے:

گفتمش: آخر چرا برہم شدی اے یار گفت
پرسشت بیجا ست، گفتم: ایں چنیں رفتار؟ گفت
دیدن ما بس بود اھل ھوس کا گفتمش
شیشۂ ما پیداست از گفتار واز کردار گفت

....

علامہ اقبال کے ذکر اور فکر کا مطالعہ بھی اسلم انصاری کے لیے ہمیشہ سے قابل کشش رہا ہے۔ اقبال سے وابستگی کی بہ صورت منظوم و منثور، دونوں حوالوں سے ہے، نظم گوئی میں انھوں نے تمثیلی

اور نیم تمثیلی انداز کو چنا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے منظوم ریڈیائی تشکیل کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ناقدین وشارحین اقبال کے افکار وتصورات بھی ان کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ اسلم انصاری نے تفہیم اقبال کے لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزانڈر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل جیسی شخصیات سے استفادہ کیا ہے۔ اقبال کی مسلم الثبوت شاعری رجائیت کی علم بردار ہے۔ اپنی تحریروں میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے فکر اقبال کے متعدد مخفی گوشوں کی تلاش کی ہے۔ اقبال کی شاعری سے ایسے عناصر کی دریافت جسے وہ قومی تنزل کے باعث وجود میں آنے والی بیساختہ آہ سر قرار دیتے ہیں۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر این۔ میری۔ شمل کہتی ہیں:

پروفیسر انصاری نے علامہ اقبال سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ جو مثنوی چراغ لالہ میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ ان میں دوسرے شاعروں میں میرزا بیدل بھی شامل ہیں۔ جنھیں اقبال اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ مثنوی جدید موضوعات کو زیر بحث لاتی ہے اور ان معاصرین پر نکتہ چینی کرتی ہے جو اپنے آپ کو سکون محض اور مرگ آفریں جدید فنون میں گم کر دیتے ہیں۔ یہ مثنوی نسل نو کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ تابناک ماضی میں پیوست اپنی جڑوں کی طرف رجوع کرے۔ (۳)

ڈاکٹر صاحب نے طویل عرصے تک ملک کے ایک قومی روزنامے میں ادبی کالم بھی لکھے،ان کالموں کو علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ ان کالموں کا اسلوب شان دار اور عالمانہ ہے۔ عام تر موضوعات کی اس انداز میں کی گئی مفصل تشریح ایک بالغ نظر انسان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہمیشہ دوسروں کے لیے مشعل راہ ہونے چاہییں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے تعلیم وتعلم کے سلسلے کو عبادت کے طور پر اپنایا،اور ایک خاموش طبع اور ہر دل عزیز استاد کا مقام حاصل کیا۔ ہمارے اساتذہ کی اکثریت پڑھتی ہے نہ لکھتی ہے بس پڑھاتی ہے۔ اساتذہ کے معاملے میں دو انتہاؤں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ بعض اساتذہ تدریسی نصاب کو ثانوی مرتبہ دیتے ہیں تو بعض اسی سے وابستہ ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ اسلم انصاری کے ہاں جس معلم کا سراغ ملتا ہے وہ دونوں میں ایک حد اعتدال پیدا کرتا ہے۔ اتنا باکمال شاعر، صاحب علم و دانش مبتدیانہ سطح پر تعلیم

دیتے ہوئے نصاب کو جس طرح دیکھتا ہے اس کی مثال دیکھیں:

ایک معلم کی تدریسی زندگی کے کئی پہلو چپکے ہی چپکے اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ ثانوی مدارج کے اردو لازمی کے نصاب میں جب بھی زندگی (از: چودھری افضل حق) کی کوئی کہانی شامل رہی مجھے ایک ان جانی سی مسرت حاصل رہی۔ یہ کہانیاں میں نے برسوں نصاب میں پڑھائی ہیں۔ اور ہر بار پڑھاتے ہوئے ایک عجیب سا لطف محسوس کیا ہے۔ ہر بار میرا ذہن زندگی کی ادبی اور فکری قدر و قیمت کی طرف مبذول ہوجاتا رہا ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس کتاب کے اسلوب کا تجزیہ ہونا چاہیے اور اس کے فکری مافیہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے (۴)

ایک مصاحبے کے دوران سوال کا جواب دیتے ہوئے اسلم انصاری استاد، معلم اور مرشد کے مابین فرق کو کچھ اس طرح سے واضح کرتے ہیں:

دیکھا جائے تو معلم، مرشد اور مرشد، معلم ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ اصطلاحی مرشد کا دائرہ تعلیم تربیت اپنے مسترشدین (مریدین) کی اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی تک محدود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے معلم ایک عمومی تصور اور مرشد ایک خاص صورت ہے۔ اگر استاد میں ایک خاص قسم کی خوبی ہو تو وہ استاد سے معلم اور معلم سے مرشد کا درجہ حاصل کرسکتا ہے (۵)

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ خود اسلم انصاری کے ہاں اقبال کا اثر و نفوذ ایک مرشد کے انداز میں دکھائی دیتا ہے، ان کے اہم اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سجاد باقر رضوی، تاج محمد خان اور ملک بشیر الرحمٰن خان کے بعد جن استاد نے ان کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سید علی عباس جلال پوری ہیں۔ طالب علم کلاس روم کے ماحول سے ایک خاص قسم کا لطف کشید کرتا ہے۔ ایک مثالی طالب علم ہی بعد میں قابل تقلید استاد کا درجہ اختیار کرسکتا ہے۔ انصاری صاحب کی بی۔اے کی کلاس میں استاد علی عباس جلال پوری جب اپنی پوری فلسفیانہ تھیوری کے ساتھ آن کھڑے ہوئے تو شاگرد اسلم انصاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہاں تک کہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی اس کا پسندیدہ مضمون ٹھہرا:

کلاس روم میں علی عباس صاحب (سید علی عباس جلال پوری) کے حضور ہم بہت دیر سے آئے، پہلے دن انھوں نے ہمیں دیوان غالب کی ردیف ی کی یہ غزل پڑھائی:

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے / تسکیں کو

دے نوید کے مرنے کی آس ہے۔ فلسفے کا پس منظر رکھنے والے استاد کے لیے غالب کی غزل کی تدریس کچھ اور ہی معانی رکھتی ہے۔ سید صاحب نے ہمیں یہ غزل کچھ اس انداز سے پڑھائی کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ادب اور شاعری کی تدریس میں پہلی بار نفسیات اور فلسفے کی اصطلاحات کا استعمال ہمارے لیے حیرت کا باعث بھی تھا اور انشراح خاطر کا سبب بھی (۶)

ہمارے نظام تعلیم کے محاسن و معایب اپنی جگہ لیکن مادیت پرستانہ معاشرے کا ایک تحفہ استاد اور شاگرد کا کمزور ہوتا ہوا رشتہ بھی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاگرد احترام استاد کے بغیر استاد کے فیضان نظر سے محروم رہتا ہے۔ اس طرح استاد بھی شاگردوں کے لیے عمومی شفقت کے رویے کے بغیر اس روحانی لذت اور قلبی راحت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا جو پڑھانے کے عمل کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے۔ معلم اور متعلم کے معدوم ہوتے رشتوں کی بحالی کی صورت یہی ہے کہ شفقت اور احترام کے دوطرفہ توازن کو بحال کیا جائے (۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی ان مختلف زاویوں کو چند صفحات پر سمیٹنا ممکن نہیں۔ ان کا پھیلاؤ دور رس اور ادراک گہرا ہے۔ وہ اپنے عہد کی ذاتی اور اجتماعی صداقتوں کے ترجمان ہیں۔ ان کے ہاں گہری عصری بصیرت دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی اقدار کے رسیا اور مذہبی افکار کے شیدا اسلم انصاری مسلم تہذیب و تمدن اور اسلامی آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی خاموشی سے شعر و سخن کی دنیا میں نیک نامی حاصل کی ہے۔ ان کا تعلق ملتان سے ہے لیکن ان کے افکار و نظریات کے اثرات قومی سطح پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ملکی منظر نامے میں تاریخ و ثقافت کے حوالے سے جو مقام ملتان کو حاصل ہے، اسلم انصاری کو اپنے ہم عصروں پر وہی فوقیت حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم انصاری، تکلمات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸
۲۔ جاوید اصغر، ڈاکٹر، گفتگو کا چراغ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲
۳۔ افتخار شفیع، محمد، اسلم انصاری، شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵
۴۔ اسلم انصاری، تکلمات، ص ۱۸
۵۔ ایضاً، ص ۱۸
۶۔ ایضاً، ص ۱۸
۷۔ ایضاً، ص ۱۸

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید ___ ایک سحر انگیز شاعرہ

اردو ادب میں بعض نام اپنی سچائی، خلوص اور تخلیقی توانائی کے باعث قاری کے دل پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتے ہیں۔ انہی معتبر ناموں میں ایک درخشاں نام ہے رخشندہ نوید۔ ان کی شاعری کا جادو قاری کو محض چند مصرعوں میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

رخشندہ نوید کی شخصیت اور شاعری لازم و ملزوم ہیں۔ انھوں نے گیارہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا اور اس کے بعد یہ سفر کبھی نہیں رکا۔ وہ خود اعتراف کرتی ہیں کہ ''میری زندگی کا سفر دراصل شاعری ہی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں داخلی کیفیات کی شدت بھی ہے اور خارجی حقیقتوں کا سچ بھی۔

پہلی کتاب—ایک پہچان کی بنیاد

ان کا پہلا مجموعہ ''پھر وصال کیسے ہو'' 2004 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی اور منیر نیازی جیسے بڑے شعرا نے ان کی شاعری میں تازگی اور نئے طرزِ احساس کو سراہا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب رخشندہ نوید نے اپنے وجود کا اعلان کیا۔

اسی کتاب میں وہ اپنے جذبات کو یوں سادہ مگر دلگداز پیرائے میں بیان کرتی ہیں:

خود اپنی ذات میں شامل کسی کو کر لیا جائے
کسی کو بھولنے کے کیا یہی آداب ہوتے ہیں

یہ شعر قاری کے دل کو چھو لینے والی شدت رکھتا ہے۔ یہ جذبہ اور سوال دراصل ان کی شاعری کا بنیادی مزاج ہے۔

رخشندہ نوید نظم میں اپنی اصل قوت رکھتی ہیں۔ ان کی مشہور نظم ''سچا سچا پیار'' میں وہ بڑے معصوم مگر گہرے سوال اٹھاتی ہیں کہ پیار کیسا ہونا چاہیے، اندھا یا ان دیکھا؟ یہ سوال ہی ان کی شاعرانہ فکر کی اصل سمت متعین کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور نظم میں وہ کہتی ہیں:

جب پرندے چھت پہ خوشیاں بانٹتے ہیں
ہجر کے صحرا میں جلتے دل کو سکوں ملتا ہے

....

یہی وہ کیفیت ہے جہاں ان کی شاعری داخلی گھٹن کو کائناتی فضا میں بدل دیتی ہے۔

رخشندہ نوید محض رومانوی شاعرہ نہیں۔ ان کے ہاں معاشرتی شعور بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ ان کی نظم ''برہنہ لاش'' معاشرے کی بے حسی پر ایک بھرپور احتجاج ہے۔ جبکہ ''بارٹر سسٹم'' تعلقات کے بدلتے رنگوں کو سامنے لاتی ہے۔

عامر عباس ناصر اعوان

وہ کھل کر کہتی ہیں:

میں نرم ہوا ہوں، مجھ سے بہاروں میں ملا کر
جو کہنا ہے، سیدھے لفظوں میں کہہ دے
خطاب والقاب کے پردے گرا دے

....

یہ براہِ راست سچائی اور بے ساختہ اظہار ہی رخشندہ نوید کا اصل اسلوب ہے۔

رخشندہ نوید کی غزلیں بھی اپنی انفرادیت رکھتی ہیں۔ نرم اور خالص نسائی لہجے میں وہ کبھی محبت کا بیان کرتی ہیں تو کبھی انا کی صدا کو:

پیاس کی شدت میں قائم ہے ابھی میری انا
کیا کروں، اک بوند پانی کس سے مانگوں، کیا کروں

....

یہ شعر محض نسائی تجربے کا نہیں بلکہ انسانی وقار اور خودی کا ایک آفاقی استعارہ ہے۔

اسی طرح ان کا ایک اور شعر دیکھئے:

مجھے پوری طرح مانگے تو سوچوں
وہ اس انداز میں سوچے تو سوچوں

ذرا نرمی سے پوچھے حال میرا
نظر بھر کر مجھے دیکھے تو سوچوں

یہ اشعار جذبے کی نرمی اور محبت کی شدت کا حسین امتزاج ہیں۔

رخشندہ نوید کا خوب صورت شعری مجموعہ ''رات مجھے اچھی لگتی ہے'' ان کے تخلیقی ارتقا کا ثبوت ہے۔ مختصر بحروں اور سادہ مگر پُراثر زبان میں انھوں نے زندگی کے کٹھن سوالات کو اشعار میں ڈھالا ہے۔

کتاب سے ایک دل موہ لینے والا شعر دیکھیے:

آج کی رات سو کے دیکھیں گے ہم
سمندر کی چارپائی پر

....

یہ محض دو مصرعے نہیں بلکہ ایک مکمل منظر ہے جو قاری کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

رخشندہ نوید کی سب سے بڑی پہچان ان کی سچائی ہے۔ وہ بناوٹ اور تصنع سے دور رہ کر براہ راست دل سے بات کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق بھی ہے، احتجاج بھی، خواب بھی ہیں اور تلخ حقیقتیں بھی۔

ان کا کلام پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے زندگی اپنی پوری شدت اور سچائی کے ساتھ قاری کے سامنے کھڑی ہو - وہ دکھ کو مسکراہٹ میں ڈھالنے والی اور کرب کو روشنی میں بدلنے والی شاعرہ ہیں۔

رخشندہ نوید کی شاعری نہ صرف قاری کے دل میں جگہ بنا چکی ہے بلکہ ادبی ادارے بھی ان کے فن کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ ''بیاض'' جیسا معتبر ادبی ماہنامہ ان کی تخلیق کو نمایاں کر رہا ہے، جو ان کے ادبی سفر کی ایک روشن منزل ہے۔

رخشندہ نوید کا شعری سفر دراصل زندگی کے حسن اور کرب دونوں کو بیان کرنے کا سفر ہے۔ وہ محبت کو پوجتی بھی ہیں اور سماج کو آئینہ بھی دکھاتی ہیں۔ یہی دوہرا پن ان کی شاعری کو ہمہ جہت اور لازوال بنا دیتا ہے۔

ان کے اشعار کی طرح ان کی شخصیت بھی دل آویز اور سادہ ہے۔ دعا ہے کہ ان کا قلم یوں ہی رواں رہے اور اردو ادب کے افق پر نئے چراغ روشن کرتا رہے۔

☆☆☆☆☆

تقدیسِ قلم: حیدر عباس

رجوعہ سادات چنیوٹ سے شاندار شاعر مولا کریم کے انتہائی منظورِ نظر مداح حیدر عباس نے تقدیسِ قلم تخلیق کر کے قارئین پر بہت بڑا احسان کیا ہے تقدیسِ قلم کے مطالعہ کا مزہ تب جا کر دو بالا ہوتا ہے جب قاری بلند فکر اور آئینہ اظہار کی معرفت سے لبریز ہو حیدر عباس نے تقدیسِ قلم کی صورت میں اپنے قاری کو سامانِ معرفت کے ساتھ ساتھ سامانِ آخرت بھی فراہم کیا ہے:

لکھا ہے کائنات کو حیرت میں ڈال کر
عباس نے فرات کے سینے پہ یا حسین

....

کسی بھی کتاب کا مطالعہ ایک مسلسل جستجو ہے ایک دائمی مشق ہے جو انسان کو مادی اور روحانی ترقی کی راہوں پر گامزن رکھتی ہے تقدیسِ قلم موصول ہوتے ہی میری یہی کوشش رہی ہے کہ میں اس میں جذب ہو کر اس کی روح کو دریافت کروں:

سردار انبیا کی رہیں مہربانیاں
مولا علی ع کا ذکرِ مبارک ہو حرزِ جاں

....

تقدیسِ قلم حیدر عباس کے تخلیقی شعور اور ان کی فکری بصیرت کا بہترین اظہار ہے حیدر عباس نے کربلا کے کرب کو جس شعور کے ساتھ بیان کیا ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے:

رموزِ حشمتِ عالیں بہ نعمتِ عظمیٰ
کساء کے سائے میں پیمانۂ حیات کا گھر

حیدر کے ہاں منفرد خیالات، فنی لطافت، تشبیہات اور کربلائی استعارے قاری کو دیر تک اپنے سحر میں رکھتے ہیں اور قاری کو ایک نئی فکری دنیا سے روشناس کراتے ہیں:

رسالتوں کا تفاخر بھی دے رہا ہے خراج
عروجِ حشمتِ خیرالانام ہے غازی

....

کربلا کے ایک ایک واقعہ کو تخلیق کار نے اپنے جذبات اور تخیل سے اس طرح آمیز کیا ہے کہ ہر منظر قاری کے سامنے زندہ ہو کر سانس لینے لگتا ہے حیدر کا اسلوب انتہائی پروقار ہے وہ سادہ انداز میں اپنا نکتہ نظر نہایت خوش سلیقگی سے بیان کرتے ہیں تقدیسِ قلم کے مطالعہ کے بعد کوئی بھی قاری یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حیدر کا اظہار یہ جاندار، مشاہدہ گہرا اور حافظہ شاندار ہے:

حیدر عباس نے تقدیسِ قلم میں ایسے موتی پروئے ہیں جنہیں پڑھ کر ہر بندہ یہی کہتا ہے کہ یہ کلام میرے عقیدے کی ترجمانی کر رہا ہے۔
کتاب کا عنوان ہی اتنا خوب صورت اور دلکش ہے کہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں جدید طرزِ فکر، لطیف جذبات کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی ضرور ہو گی خانوادۂ تطہیر کی مدحت کسی کسی کے حصے آتی ہے حیدر عباس اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہے کہ وہ تقدیسِ قلم کا خالق ہے:

تھاما جبریل نے پیمانۂ عرفانِ علی
جب کھلا عرش پہ میخانۂ عرفانِ علی

☆☆☆☆☆

اسد رضا سحر

تلمیح اور کلاسیکی غزل: ڈاکٹر محسن کی تحقیقی بصیرت کا جائزہ

ڈاکٹر محسن اردو ادب کے سنجیدہ محقق اور ناقد ہیں۔ انھوں نے اپنی علمی کاوشوں سے نہ صرف ادب کے طلبہ کو قیمتی مواد فراہم کیا ہے بل کہ تنقید کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحقیقی وابستگی خاص طور پر کلاسیکی ادب اور اس کے فنی پہلوؤں کے ساتھ ہے۔ کلاسیکی اردو غزل محض عشق و محبت کا بیان نہیں بل کہ تہذیبی، مذہبی اور تاریخی شعور کی حامل صنفِ سخن ہے۔ اس میں تلمیح (اشارہ یا حوالہ) ایک ایسا اسلوبیاتی عنصر ہے جو غزل کو معنوی گہرائی، وسعت اور جمالیاتی نزاکت عطا کرتا ہے۔

"کلاسکی غزل میں تلمیحات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کتاب کے فلیپ پر ان کی تعلیمی اور تحقیقی خدمات کا جامع ذکر موجود ہے جو ان کی سنجیدہ علمی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔

اردو غزل صدیوں پر محیط ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو نہ صرف ہمارے ادبی ورثے بل کہ ہماری تہذیبی شناخت کا حصہ بھی ہے۔ میر، غالب، سودا، مومن اور دیگر شعرا نے غزل کو فکری اور فنی سطح پر وہ بلندی عطا کی جس کی مثال دنیا کی کم ہی ادبیات میں ملتی ہے۔ غزل کی مقبولیت کے باوجود اس کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ڈاکٹر محسن نے اپنی کتاب میں نہایت اہم کام انجام دیا ہے۔ یہ کتاب اردو غزل کے تحقیقی و تنقیدی مباحث کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے۔

کتاب کا بنیادی مقصد کلاسیکی غزل کے مطالعے کو محض عشقیہ یا جمالیاتی اظہار تک محدود نہ رکھنا بل کہ اسے تحقیقی و تنقیدی

کومل شہزادی

زاویوں سے دیکھتا ہے۔
کتاب کی ساخت اس بات کی مظہر ہے کہ مصنف نے تحقیقی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تنقیدی تجزیے کو شامل کیا ہے۔
کتاب کے ہر باب میں:
مستند حوالہ جات کا استعمال کیا گیا ہے۔
اشعار کے ذریعے دلائل کو تقویت دی گئی ہے۔ تحقیق اور تنقید کو ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ کتاب محض معلوماتی نہیں بل کہ قاری کو غور وفکر پر مجبور کرتی ہے۔
ڈاکٹر محسن کا اسلوب سنجیدہ، شگفتہ اور محققانہ ہے۔ وہ مشکل مباحث کو بھی روانی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اشعار کی پیشکش سے تحریر کو بوجھل ہونے سے بچاتے ہیں۔ قاری کو ایک ساتھ علمی گہرائی اور ادبی لذت میسر آتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر ان طبقات کے لیے کارآمد ہے: ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ، جو غزل پر تحقیقی مقالے لکھ رہے ہیں۔ نقاد اور محققین، جو کلاسیکی ادب میں نئی جہات تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ قارئین، جو غزل کی تہہ در تہہ معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔
ڈاکٹر محسن کی یہ کتاب اردو تنقید و تحقیق میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ غزل کے جمالیاتی حسن کے ساتھ ساتھ اس کے تحقیقی و فکری پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں روایت اور تحقیق دونوں کو توازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ تصنیف اردو ادب کے محققین اور قارئین کے لیے ایک مستند حوالہ ہے اور آنے والے وقت میں کلاسیکی غزل کے مطالعات کے لیے بنیادی ماخذ سمجھی جائے گی۔ ڈاکٹر محسن کو اُن کے عمدہ کام پر دلی مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔ دعا ہے کہ وہ اسی طرح علم و ادب کی دنیا میں نئی کامیابیاں حاصل کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

مقبول زیدی...... عشق___ ادب کی روشن پہچان

کراچی کی ادبی فضا میں مقبول زیدی ایک ایسا نام ہے جو اپنی فکری تازگی، فنی پختگی اور خلوصِ دل سے کی جانے والی ادبی خدمات کے باعث خاص امتیاز رکھتا ہے۔ آپ نے غزل کے پیرایے میں انسانی جذبات، زندگی کی دھڑکنوں اور عصری حسیت کو اس طرح سمویا ہے کہ قاری نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بل کہ سوچ کے نئے زاویوں سے بھی روشناس ہوتا ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''ابھی کچھ پھول تازہ ہیں'' اپنی اشاعت کے بعد فوری طور پر قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے اور آپ کی انفرادیت اور تخلیقی قوت کا بھرپور ثبوت فراہم کرتا ہے۔

لیکن مقبول زیدی کی ادبی جہتیں صرف غزل تک محدود نہیں۔ آپ کو رثائی ادب سے جو والہانہ لگاؤ اور قلبی وابستگی ہے، وہ آپ کی شخصیت اور فن دونوں کو ایک خاص تقدس عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو نہ صرف تخلیقِ ادب کے لیے وقف کیا بل کہ فروغِ ادب کی راہوں میں بھی چراغ جلائے۔ آپ ''سلام گزار ادبی فورم'' کے بانی، سرپرست اور چیئرمین ہیں، اور اب تک آپ کی سرپرستی میں 195 ماہانہ نشستیں تواتر اور تسلسل کے ساتھ منعقد ہو چکی ہیں۔ یہ سلسلہ اردو کی ادبی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ انھی نشستوں میں پڑھے جانے والے سلام کو آپ نے کتابی شکل دے کر محفوظ کیا اور انھیں ایسے دلکش عنوانات دیے جو عقیدت اور فن کا حسین امتزاج ہیں: ''حرفِ زیارت گزار''، ''مودت کا سفر'' اور ''عقیدت کی منزل''۔

مقبول زیدی کی تخلیقی دنیا وسیع اور رنگارنگ ہے۔ آپ کے یہاں حمد میں خالقِ کائنات کی حمد و ثنا کی شفاف جھلک، نعت میں حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے عشق و عقیدت کا والہانہ اظہار، سلام میں شہدائے کربلا کے حضور اشکبار عقیدت، منقبت میں اہلِ بیتؑ اطہار کی عظمت و رفعت کا تذکرہ کربلا کے دکھ اور قربانی کی سچی عکاسی ملتی ہے۔ یہ سب اصناف آپ کے ذوق، علم اور جذبے کی وہ ترجمان ہیں جو ادب کو صرف الفاظ نہیں بل کہ احساس کی روشنی عطا کرتی ہیں۔

آپ کے کلام میں عقیدت کی صداقت اور فن کی باریکیاں اس خوبی سے یکجا ہیں کہ قاری محض پڑھنے والا نہیں رہتا بل کہ ایک روحانی سفر کا مسافر بن جاتا ہے۔ آپ کے اشعار دل کو چھوتے ہیں، ذہن کو جھنجھوڑتے ہیں اور روح کو روشنی بخشتے ہیں۔

بلاشبہ، مقبول زیدی صرف ایک شاعر نہیں بل کہ ایک ایسے عاشقِ ادب، خادمِ اہلِ بیتؑ اور نقیبِ عشقِ رسولؐ ہیں جنھوں نے اردو ادب کو نہ صرف خوب صورت اشعار دیے بل کہ محفلوں، کتابوں اور دلوں تک پہنچا کر اسے مزید زندہ و تابندہ بنا دیا۔

دعا ہے کہ مقبول زیدی کا یہ تخلیقی سفر یونہی عشق، اخلاص اور روشنی کے ساتھ جاری و ساری رہے اور آپ کا کلام ہمیشہ قلوب و اذہان کو منور کرتا رہے۔۔۔

☆☆☆☆☆

رانا خالد محمود قیصر

ڈاکٹر نذیر تبسم کچھ یادیں

پروفیسر ڈاکٹر نذیر تبسم کے انتقال کی خبر سنی تو ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان کی یادوں کا ایک سلسلہ دل کے تار چھیڑنے لگا۔ کیسی موہنی شخصیت تھی ڈاکٹر نذیر تبسم کی۔ ان سے پہلی ملاقات اتنی خوشگوار تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی۔ 2003 کی بات ہے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں ہمارا ایم اے اردو کا زبانی امتحان تھا۔ ممتحن تھے ڈاکٹر نذیر تبسم اور پروفیسر عبدالقادر ساجد، ہمارے ساتھ ہمارے ایک دوست سردار منیر بھی زبانی امتحان دے رہے تھے۔ ہم سب اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ سردار منیر کی باری آئی اور وہ انٹرویو کے کمرے میں جیسے ہی داخل ہوا جہاں دونوں ممتحن تشریف فرما تھے منیر کے داخل ہوتے ہی کمرے میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ سب حیران تھے کہ ایسا کیا ہوا۔!! میں نے سب کو بتایا پہلے "دو گنجے پروفیسر بیٹھے تھے منیر کے داخل ہوتے ہی نذیر تبسم صاحب نے کہا ہوگا، لو جی ساجد صاحب ہماری طرح کا ایک اور آ گیا، اس پر قہقہہ بلند ہوا ہوگا۔" اور ہوا بھی یوں ہی جب منیر امتحان سے واپس آیا اور ہم نے اس سے قہقہے کی وجہ پوچھی تو اس نے وہی جواب دیا جو میں نے بتایا تھا کہنے لگا۔ "جونہی میں نے اندر قدم رکھا ڈاکٹر نذیر تبسم صاحب کھلکھلا کر ہنسے اور کہا ساجد صاحب دیکھو ہماری طرح کا ایک اور بھی آ گیا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس دوران زبانی امتحان لیتے ہوئے سب سے پہلے میرا تعارف پوچھا، گاؤں کا نام سنتے ہی سوال پوچھا کہ آپ کے گاؤں کے قریب ہی ہندکو کے ایک معروف ادیب اور شاعر ہیں، کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟ میں نے جب حیدر زمان حیدر کا نام لیا تو بہت خوش ہوئے۔ اسی طرح مجھ سے ہزارہ کے باقی ادیبوں اور اپنے صوبہ خیبر پختونخوا کے ادیبوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب میرا زبانی امتحان لے چکے تو عبدالقادر ساجد صاحب کی طرف دیکھ کر میری تعریف اور مجھے

قمر زمان

شاباش دی۔ مجھے ان کی معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے معاصرین کے لیے خوب صورت جذبات دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان سے اس پہلی ملاقات کا تاثر ہمیشہ قائم رہا۔ اس ملاقات کا احوال ان کو بعد میں بھی میں نے سنایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم ایک علیحدہ ہی طبیعت کے مالک تھے۔ انھیں جب بھی دیکھا اور سنا وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ نظر آئے۔ ان کا بطور شاعر وادیب اور استاد ہر جگہ احترام کیا جاتا تھا۔ وہ دوستوں کی محفل کی جان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک یادگار ملاقات 2019 میں ان کے گھر واقعہ بہار کالونی میں ہوئی۔ میرا پشاور جانا ہوا تو میں نے انھیں فون کیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اپنی روایتی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے کہنے لگے ''یہ تو خوشی کی بات ہے'' اور یوں میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا عصر کا وقت تھا میں ان کے گھر پہنچا تو بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے معذرت چاہی کہ آپ کے معمولات میں مخل ہوا۔ کہنے لگے قمر زمان ''مہمان تے کدا دی رحمت ہوندے'' مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے)۔ اس کے بعد ہم ان کے مہمان خانے میں بیٹھے اور دیر تک مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ سلطان سکون صاحب کے حوالے سے پوچھا۔ ان دنوں میں سکون صاحب کے حوالے سے اکادمی ادبیات کے سلسلے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''سلطان سکون شخصیت اور فن'' مرتب کر رہا تھا۔ جب انھیں اس حوالے سے بتایا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ''بڑے خوش قسمت ہو یارا تنے بڑے آدمی پہ کام کر رہے۔'' اس کے ساتھ تاکید بھی کی کہ ان سے ملاقات کرتے رہا کرو، وہ لوگ بڑے ہیرے قسم کے لوگ ہیں۔ اسی طرح آصف ثاقب صاحب، صوفی عبدالرشید صاحب، بشیر سوز صاحب اور دیگر بزرگوں کا بھی بڑی محبت سے تذکرہ کیا۔ اس خوش گوار ملاقات کے دوران انھوں نے مجھے اپنی ضخیم کتاب ''سرحد کے غزل گو شعرا'' جو غالباً ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا، عطا کی۔ اس کتاب کو صوبہ خیبر پختونخوا کے غزل گو شعرا کا ایک انسائیکلوپیڈیا کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جس میں 1947 سے لے کر 2001 کے ایک سو چھ شعرا کے 212 شعری مجموعوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا شاعری کا مجموعہ ''کیسے رائیگاں ہوئے ہم'' عنایت فرمایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس کا پیش لفظ ضرور پڑھنا، یہ میں نے اپنی بیگم کے بارے میں لکھا ہے شاید تمھیں ایسا پیش لفظ کہیں اور پڑھنے کو نہ ملے۔ یقین جانیے کہ ہو بھی یہی وہ پیش لفظ کیا تھا محبت کی ایک ایسی خوب صورت داستان تھی اپنی شریک حیات پر لکھا گیا یا تاثراتی پیش لفظ ان کی شاعری کی طرح قاری کو اپنا حصار

میں لے لیتا ہے۔ محبت کی ایسی چاشنی سے تحریر ہوا ہے کہ اردو ادب میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ کو بعد از مرگ بے مثل خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ شاندار ملاقات میری یادوں کے سرمائے میں ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ان سے آپ گھنٹوں باتیں کرتے رہیں تو سیر نہیں ہوتے، لیکن افطاری سے کچھ دیر پہلے ان سے اجازت لینی پڑی، انھوں نے مجھے افطاری کے لیے کہا لیکن میں نے کسی اور جگہ پہنچنا تھا اس لیے ان سے معذرت کی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے وہی اپنے روایتی تپاک سے ملے اور مسکراتے چہرے سے رخصت کیا۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی مٹھاس تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم ملک کی ہر دل عزیز ادبی شخصیت تھے۔ ان سے مسلسل رابطہ رہا۔ ان سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی علمی بات سیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے کتاب میلے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ یوں ملے جیسے کوئی اپنے ہم عمر اور بے تکلف دوستوں سے ملتا ہے۔ ناصر علی سید بھی ان کے ساتھ تھے دونوں سے ہندکو میں بات ہوئی۔ وہ اکثر ہندکو میں بات کرتے تو بہت اچھا لگتا اور ایک خاص اپنائیت کا احساس ہوتا۔ میں نے اپنے دوستوں کو ان سے متعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے اور سب کو بہت سراہا کہ ایسی جگہوں پہ ضرور جانا چاہیے اور کتابوں سے شغف ہونا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم سے میری آخری ملاقات ایبٹ آباد میں ہوئی۔ وہ جب بھی کسی تقریب کے لیے ایبٹ آباد تشریف لاتے تو یہاں انھیں بڑی عزت دی جاتی کیوں کہ وہ بھی ہزارہ کے اہلِ قلم کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے ہندکو ادب میں خدمات انجام دینے والوں کے اعزاز میں تقریب کا انعقاد کیا۔ ایوارڈز کی اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر نذیر تبسم تھے جو پشاور سے خاص طور پر تقریب کے لیے آئے تھے۔ وہ یہاں کے ادیبوں کے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے ملے، وہ بڑے کھلے دل کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی گفت گو میں بھی ہزارہ کے سب اہلِ قلم کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ان سے جب بھی کسی مسئلے پر بات ہوتی تو وہ ایک شفیق بزرگ کی طرح رہنمائی فرماتے۔ گزشتہ برس مجھے پروفیسر محمد طاہر فاروقی کے حوالے سے کچھ معلومات درکار تھیں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کیا، کیوں کہ آپ دونوں پشاور یونیورسٹی میں رہ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محبت اور شفقت سے بتایا کہ شعبہ اردو جامعہ پشاور کے مجلّے ''خیابان'' نے پروفیسر طاہر فاروقی نمبر شائع کیا تھا اس میں ان کے

حوالے سے مکمل معلومات مل جائیں گی۔ جب میں نے تحقیق کی تو مجھے خیابان کا وہ شمارہ مل گیا جس میں ان کے حوالے سے مکمل معلومات کے ساتھ ساتھ ان کی تزکیہ کی یادوں کا باب بھی شامل تھا۔ جہاں وہ انقرہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم ایسے ہی اپنے طلبہ کی بھی رہنمائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم جیسے بزرگ معاشرے میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہوتے ہیں جو ہر طرف اپنی خوشبو بکھیرتے ہیں اور لوگوں کو معطر کرتے ہیں۔ ان کے انتقال کا سانحہ پاکستانی ادب بالخصوص خیبر پختونخوا کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم کا تعلق بزرگوں کی اس نسل سے تھا جن کے خمیر میں تہذیب و روایت تحمل اور رواداری جیسے اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے علم و ادب اور تہذیب و روایت کی جو میراث پائی تھی اس کو بے دریغ لٹایا ہے۔ ڈاکٹر نذیر تبسم اپنی وضع دار اور محبت سے گندھی شخصیت کی وجہ سے اپنے معاصرین میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میری سلطان سکون صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو مختلف شخصیات کے حوالے سے گفتگو رہتی ہے۔ خیبر پختونخوا کی ہزارہ کے علاوہ دو شخصیات کے وہ بڑے مداح ہیں۔ ان میں ایک پروفیسر فارغ بخاری اور دوسرے ڈاکٹر نذیر تبسم ہیں۔ وہ انہیں اکثر بہت اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ سلطان سکون صاحب کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو بڑے رنجیدہ ہوئے۔ ان کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کی۔ ڈاکٹر نذیر تبسم ہمیشہ دوستوں میں چہکنے والی شخصیت تھے۔ وہ اپنے دوستوں میں محبت بانٹتے تھے اور اپنے اس شعر کی مانند تھے:

اسے دیکھتے کبھی جا کے یاروں کی بزم میں
وہ جو دوستی کی نظیر تھا، وہ نذیر تھا

انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ دوستوں میں خوب چہکتے رہے۔ دوستوں پہ اپنی محبت نچھاور کرتے رہے، بالکل لیکن خاموشی سے جہان فانی سے رخصت ہوئے اپنے اس شعر کی طرح:

چلا جاؤں گا دامن جھاڑ کے ایک دن اچانک
تبسم میں تو ویسے بھی فقیر آدمی ہوں

ڈاکٹر نذیر تبسم بلاشبہ ایک فقیر منش انسان تھے۔ ایسا خوش پوش فقیر جو دوسروں میں خوشیاں بانٹتا ہو۔ جس کے چہرے پہ ہر وقت تبسم بکھرا ہوتا۔ ہمارے جیسے گھٹن زدہ معاشرے میں ڈاکٹر نذیر تبسم جیسے لوگ غنیمت ہوا کرتے ہیں۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ ان کی قبر کو اپنے نور سے منور کریں اور انہیں جنت الفردوس کے باغات کی سیر نصیب ہو۔

☆☆☆☆☆

داستان سے ناول تک

فیصل فارقلیط

برصغیر میں انیسویں صدی کا معاشرہ زبردست تہذیبی تصادم کا ایک جھلک نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ مشرقی تہذیب پر مغرب کی ابتداءً آہستہ رو ملمع کاری بعد ازاں ایک زبردست لطمے کی صورت اختیار کر گئی۔ یوں اس تہذیبی وثقافتی مڈبھیڑ میں مشرقی تہذیب کے کئی پیمانے زیرِ آب چلے گئے۔ فن، فکر، فلسفہ، سے لے کر ذہنی اہتزاز کے ذرائع تک مغربی تصورات میں ملفوف ہو گئے۔ بعینہ اس کے جمالیاتی پہلو یعنی فنونِ لطیفہ بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہاں ہم فنونِ لطیفہ ہی میں سے ایک اہم فن، فنِ داستان گوئی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

داستان اور ناول دونوں کا تعلق گو کہ بیانیہ سے ہے۔ تاہم اول الذکر زبانی بیانیہ جبکہ ثانی الذکر کا تعلق تحریری بیانیہ سے ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی شعریات اور رسومیات جدا جدا ہیں۔ المیہ یہ پیدا ہوا کہ داستانی ادب کے تحریری سانچے میں آنے کے بعد اسے ناول کی شعریات کے تحت پرکھنا شروع کر دیا گیا۔ حالانکہ دونوں اصناف کے تخلیقی پس منظر، تصورِ کائنات اور Audience میں واضح فرق تھا۔ داستان خالصتاً مشرق کی تہذیبی صنفِ سخن ہے۔ اس کے تصورِ کائنات پر ہندوستان کے عوام کے عقائد و تصورات کی گہری چھاپ ہے۔ داستان کی فضا خالصتاً زمینی ہوتے ہوئے بھی خواب ناکی کی حامل ہوتی ہے۔ پورے ماحول پر ایک افسوں اور سحر کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ داستان میں واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے لیے داستان گو کسی منطقی سبب کا متلاشی نہیں رہتا بلکہ یہ فریضہ داستان میں تحیر کا عنصر ادا کرتا ہے یعنی واقعات کے بہاؤ میں کرداروں کی غیر معمولی اور فوق البشر صلاحیتیں ہمہ وقت متحرک رہتی ہیں اور یوں واقعات بغیر کسی تعطل کے رواں رہتے ہیں۔

ایک اہم بات جس کا تعلق ہماری ادبی تاریخ ہماری، فہرست استناد یعنی canon کی تشکیل اور ادبی روایت کے بارے میں ہمارے رویے سے ہے۔ داستان امیر حمزہ اور اس کے تحت آنے والی تمام داستانیں ہماری فہرست استناد سے باہر ہی رہی ہیں۔ کیونکہ جس زمانے میں ہماری فہرست استناد تشکیل ہو رہی تھی، اسی زمانے میں ہمارے ہاں ناول کا بول بالا ہو رہا تھا اور ادب کے ماہرین نے یہ فرض کر لیا تھا کہ

ناول کے ہوتے ہوئے کسی اور نثری بیانیہ کی ہمیں ضرورت نہیں۔

ناول اور داستان میں ایک اور فرق اس کے کرداروں کی پیشکش میں ہے۔ ناول نگار کو کردار نگاری کے ضمن میں زبردست چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم داستان نگار کردار کی تشکیل کے ضمن میں مکمل آزاد ہوتا ہے۔ داستان کے کردار سامعین کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے سامعین کے سامنے داستان کے پس منظر پر متحرک وہ تمام ماحول آنکھوں کے سامنے عیاں ہوتا ہے جو کہ خود ان کے معاشرے اور معاشرے کی تشکیل میں اہمیت کے حامل عناصر کارفرما ہوتا ہے۔

داستان اور ناول دونوں میں حقیقت پسندی کا تصور بھی جدا جدا ہے۔ داستان کے غالب کرداروں میں بھوت پریت، طلسم، دیو، پری یہ وہ تمام کردار تھے جو معاصر معاشرے میں بال شک وشبہ اہمیت رکھتے تھے۔ چونکہ یہ سب عناصر معاشرے کے افراد کے لیے یا سامعین کے لیے اجنبی نہ تھے - لہذا یہی عنصر داستان میں ان کرداروں کے افعال کو سامعین کے لیے قابل قبول بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ تمام عناصر بہرحال موجود ہیں اور ان کے محیر العقول واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں--- خواہ بالفعل یا بالقوت---

یا وہی ہے جو اعتبار کیا

ناول میں تصور حقیقت بالکل مختلف شے ہے۔ داستان کا تصور حقیقت دو اصولوں پر استوار ہے۔

1. ممکنات عقلیہ: جن کے حساب سے سب ممکن ہے۔

2. اعتقاد عوام: یعنی سامعین یہ فرض کر سکیں کہ ایسا کسی زمانے میں ہوا ہوگا۔

زبانی بیانیہ مثل دریا کے ہے۔ یہ بہتا چال جاتا ہے۔ کہیں گھٹتا ہے کہیں بڑھتا، پھر بھی یکساں رہتا ہے۔ میلکم السٹر نے اس کو بیان کرنے کے لیے خوب صورت قول کا سہارا لیا ہے۔

You never step into the same river twice

داستان اور اس کے تمام تر متعلقات زبانی تہذیب کے زیر اثر معرض وجود میں آئے ہیں - بیان کنندہ ، راوی، سامعین، پھر داستان کے تخلیقی وجود میں شامل مناظر، نظری و عملی مباحث، کردار اور تخلیقی میچ، یہ تمام عناصر Oral Tradition کے تابع ہیں - والٹر اونگ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

Oral زبانی تہذیبوں Civilization میں آپ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ کی عملی حافظے میں محفوظ ہوتا ہے۔ جس چیز کو آپ بیان کے وقت حافظے

کی تا حوت سے نکال نہیں سکتے وہ اس وقت یہ بیان کی حد تک نہ موجود ہوتی ہے۔

(Walter Ong)

داستان میں کرداروں کے انجام کے بجائے واقعات کی اہمیت ہوتی ہے۔ اکثر واقعات غیر اختتام پزیر ہوتے ہیں۔ یوں داستان ایک GrandDesign پیش کرتی ہے جس میں تمام کردار ہمہ وقت فعال تو رہتے ہیں تاہم خود ان کا انجام اکثر Open Ended چھوڑ دیا جاتا ہے۔

Art is not to represent life, in what is most cases essential about life, it must be life.

جس قصے کا انجام پہلے اس سے معلوم ہو یعنی دیوتاؤں (ہماری داستانی تہذیب میں تقدیر، God's Grace) نے سب کچھ پہلے سے طے کر دیا ہو تو پھر انسانی کوشش انجام کے بارے میں تجسس اصرار کا مل یہ سب اس بیانیہ کی حد تک بیکاری ہو جاتے ہیں بلکہ زبانی بیانیہ وجود ہی اس لیے اتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ہماری کائنات میں انسان اپنی ہی کوشش کرتا ہے لیکن انجام کے بارے میں اس سے کوئی اختیار نہیں زیطان اگر قصہ ختم ہو تو زندگی ختم ہو جائے تو اس سے پیمانہ امروز و فردہ سے ناپ جاویداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی داستان کا ختم نہ ہونا خود اس بات حیات ہے ہاں حیات کی پیشکش کا نظریہ طریقہ اور زاویہ مختلف ہو سکتے ہیں یا گہری نظر ڈالنے میں لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ دستانے اس وقت کے سامعین کے لیے بالکل وہی حیثیت رکھتی تھی جو آج کل کی قارئین کے لیے ناول کی ہے۔ داستان اپنی جزئیات میں mimetic لیکن اپنی اصل الاصول میں anti-mimetic ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ موثر واقعات اور مقامات کا تذکرہ کر کے داستان گو ہمارا مذاق اڑانا چاہتا ہو کہ آپ لوگ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ تخیل کی دنیا اور حقیقی دنیا میں دراصل کوئی ربط نہیں اگر آپ داستان سن رہے ہیں تو اسے سنیے لیکن یہ نہ بھولیے کہ وہ دنیا حقیقت جو حقیقت پہ قائم ہے تخیلی دنیا میں ڈال دی جائے تو حقیقی دنیا زیادہ ٹھوس ہو جاتی ہے معاصر حوالوں کے بیان کے لیے اپنی تخیلی دنیا سے جست لگا کر داستان گو اچانک اپنے ہی معاشرے کے حالت بیان کرنا شروع کر دے تو اچنبھے کی بات نہ ہوگی۔

"شہدے کا بھیس بدلتے ہوئے قران نے کہا ہم رات کو عالم باغ تک نہ جائیں گے۔ رات کو بہت سناٹا ہوتا ہے تلنگے نے ایک دن گولی ماردی ہوتی اپنی جان بچانا ضرور ہے ایسے تمام ایسے مقام پر جانا سراسر قصور ہے۔ حسین الدولہ

کے امام باڑے تک چل سکتے ہیں۔
وہاں بیچارے ضرورت مند قرضدار لوگ قید ہیں۔ نہر کا بھی کنارہ ہے۔
چوبدار نے کہا ان دونوں مقام پر جانا منظور نہیں سامنے قریب وزیر گنج ایک بادشاہ قید ہے۔ چند نگہبان ہمارے مالک نے مقرر کیے ہیں، ان کے لیے یہ شراب جاتی ہے۔
(طلسم ہوش ربا، جلد ششم)

یہ اقتباس یقیناً سیاسی اور سماجی اہمیت رکھتا ہے اور داستان گو کہ تخیلی منطق سے یکسر میز ہے طلسم ہوشربا میں انگریزی سپاہیوں کی چیرہ دستیاں، شہر کے اصل باشندوں کی مفلوک الحالی اور انیسویں صدی کے لکھنؤ میں عام انسانوں کے لیے عدم سلامتی اور قحط تحفظ کی طرف صاف صاف اشارے ملتے ہیں۔

طوفان مغرب کے طمانچوں سے عظیم الجثہ مشرقی تہذیب رو بہ زوال تھی تقریباً ڈیڑھ صدی پر مشتمل تہذیبی روایات رفتہ رفتہ متروک ہو چلی تھیں۔ تہذیب کے ساتھ اس کے مختلف عناصر مثال داستان گوئی کی مقبولیت بھی میں بھی کمی آئی مقبولیت کی اس کمی کا ایک منظر مربی کے زوال یا فقدان کی شکل میں نکال کچھ اقتدار تو دربار کی سیاسی دویاں سے ہی ترک ہو گئیں بقیہ کمپنی کے نوآبادیاتی عزائم کے آگے نہ ٹھہر سکیں مشرقی علوم وفنون قصہ کوتاہ قرار پائے چنانچہ باغ و بہار کو ورس کے جگہ دینے سے قبل Dunken Forbes نے اس کے متن میں تحریف کرتے ہوئے لکھا:

"In Mir Aman's original text there occurred a few passages of an objectionable nature such as we meet in all Oriental compositions"

اور اب داستان گو کے لیے ذریعے معاش کے دونوں راستے مسدود ہو چلے تھے۔ اول طبقہ اشرافیہ یا دربار کی دست شفقت سے محرومی، دوم سامعین یعنی عوام میں زبان فہمی کی استعداد میں کمی۔ ثانی الذکر کی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کی ایما پر اردو زبان کی پے در پے صفائی کے عمل اور اس زبان کے دو چشموں عربی اور فارسی کی حوصلہ شکنی۔ اب زبان محض مشینی یا میکانکی انداز اختیار کر رہی تھی۔ اس کا مطمع نظر اسے اس صنف کے لیے قابل قبول بنانا تھا جس کا نام ناول تھا۔ ناول چونکہ تحریری بیانیہ سے متعلق تھا اور داستان کے مقابلے میں مختصر بھی۔ پرنٹنگ پریس کی استعداد بھی ناولوں کو زیور طبع سے آراستہ کرنے تک محدود تھی۔

یوں داستان جو کہ SmallScale Industry تھی ناول کی لارج سکیل پروڈکشن کے لیے ایک لقمہ تر ثابت ہوئی۔

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی کے مجموعۂ حمد ''کُن فیکون'' کا تاثراتی مطالعہ

احسان اللہ طاہر

اگر آپ ریاض ندیم نیازی کا مجموعۂ حمد ''کُن فیکون'' پڑھنے کے خواہش مند ہیں تو پہلے آپ مذکورہ کتاب کے پہلے باب مناجات کو ضرور پڑھیں کیوں کہ یہ مناجات ہی ان کی حمد کی بنیاد ہیں۔ کسی انسان کی دعائیں اُس کی زندگی کا عکس ہوتی ہیں۔ اُس کے فکر کا جمال ہوتی ہیں۔ وہ اُس وقت اپنے خالق و مالک سے کلام کر رہا ہوتا ہے جو کبھی آنسوؤں کی زبان میں ہوتا ہے تو کبھی لفظوں اور آہوں کے ساتھ اور اُس کو یا تو مانگنے والا جانتا ہے یا عطا کرنے والا۔ میرا خیال ہے کہ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اپنی اِس کتاب کا انتساب بھی ''اُن دعاؤں کے نام جنھیں صرف میں اور میرا خدا جانتا ہے'' اِسی لیے لکھا ہے۔ یہ رشتہ صرف بندے اور معبود کا ہے۔

ریاض ندیم نیازی نے اپنی مناجات میں خدائے وحدہٗ لاشریک سے باطن کی آنکھوں کا نور مانگا ہے کہ وہ اُس کی تخلیق کے مظہر سمندر، پربت، شمس و قمر کو دیکھ کر خدائے یکتا کی حمد و ثنا کر سکے۔ وہ ذہنِ رسا مانگتا ہے جو مدحت کا ہنر جانتا ہو۔ اللہ رب العزت سے حمد کے شمس و قمر مانگتے ہیں کہ اپنے بندہ ہونے کا احساس دل و روح میں زندہ رہے۔ خدائے لم یزل سے بندہ پروری مانگی ہے کہ اُس اول و آخر کی نیابت کی جا سکے۔ شعورِ بندگی کی دعا کی ہے کہ ہر وقت اُس کے حصارِ لطف میں رہا جا سکے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ درودی لذتیں مانگی ہیں جو جذبوں کو چاشنی اور عمل کو خوش بُو عطا کرتی ہیں۔ سانسوں میں سچائی اور پھونکوں میں تاثیر بھرتی ہیں۔ شعری مجموعے ''کُن فیکون'' کا تخلیق کار اِس بات کا اِدراک رکھتا ہے کہ دعاؤں کے لفظ بخشنے والا، اپنے یقین کی خبر اور فکر و نظر عطا کرنے والا ہی چشمِ تر بھی عطا کرتا ہے اور دعاؤں میں اثر بھی وہی رکھتا ہے۔ تمناؤں کے شجر پہ اُس کے کُن سے ثمر آتے ہیں۔ ظلمتِ شب سے زندگی اُس کے کُن سے سحر دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض ندیم نیازی نے اپنی مناجات میں، دعاؤں میں مالکِ یوم الدین

سے سرکارِ دو عالم کی محبت مانگ کر اپنے آپ کو بندگی میں مکمل کرنا چاہا ہے۔ موصوف نے اپنی دعاؤں میں افکار کے لیے شادابی اور اظہار کے لیے اشکوں کی طراوت مانگی ہے اور یہ سب کچھ انھوں نے اس یقین سے مانگا ہے کہ دینے والا، عطا کرنے والا وہی ایک خالق و مالک ہے۔ اُن کا یہی یقین اور ایمان اُن کی حمد میں شعری حُسن کا روپ دھار کر اُن کی دعاؤں کا اثر کہ ”دل کو پاکیزہ خیالات سے بھر دے“ تو اندھیروں کو مرے نورِ سحر کا حوالہ بنتا ہے۔ جب ہم اِن کی حمد کا مطالعہ کرتے ہیں تو پہلا تاثر اِن کی دعاؤں میں جو بنتا ہے کہ مانگنے والے نے ربِّ عظیم سے، لم یلد ولم یولد سے جو مانگا ہے اسے تخلیقِ حمد کی صورت میں خوب ملا ہے اور اگر وہ کہتا ہے کہ:

یہ کائنات کی تخلیق کہہ رہی ہے ندیم
کہ مجھ کو دیکھ لو میں ہوں نہالِ کُن فیکون

[ص:۲۸]

ذرا فلک کی بناوٹ پہ غور تو کر لو
ملے گی اور کہاں یوں مثالِ کن فیکون

[ص:۲۷]

”کُن فیکون“ کی پہلی چار حمدوں، جن کی ردیف چراغ ہے، کے ہر شعر میں چراغ کی معنویت اور اس کا فکری پہلو پڑھنے والوں کو تخلیق کار کی دعاؤں کی قبولیت کا اثر دکھاتا ہے۔ بے شک اللہ ربّ العزت خیر الرازقین ہے۔ اُس سے جو مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے۔

ریاض ندیم نیازی نے بندگی کے لیے، اُس کی حمد و ثنا کے لیے جو چراغ مانگے ہیں وہ اُس کی حمد میں جل اُٹھے ہیں اور یہ ظاہر اُسی کتاب میں ہوئے ہیں حالاں کہ حمد و نعت کے حوالے سے بلوچستان میں موصوف کا ایک معتبر اور خاص حوالہ ہے جب کہ پاکستان کے تمام ادبی حلقوں سے بھی اِن کا کام داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ موصوف کی اِن چار حمدوں میں چراغ کبھی لفظ بن کر تو کبھی استعارہ بن کر، کبھی علامت کے روپ میں تو کبھی زندگی بن کر، کبھی بندگی میں ڈھل کر تو کبھی تخلیق بن کر پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے اور وہ اِن حمدوں کو یوں پڑھتا ہے جیسے وہ اس پہ اُتر رہی ہوں اسے چراغ بخش رہی ہوں۔ یہ حمدیں قارئین کا رشتہ اپنے مالک سے مضبوط کرتی ہیں، سجدوں سے لو لگاتی ہیں اور ظلمت میں اُجالے بن کر اس کو حمد و ثنا کے ڈھنگ سکھاتی ہیں:

جو حکمِ رب سے جلیں تو بجھیں نہ جل کے چراغ
جلیں گے تا بہ ابد جابجے ازل کے چراغ

[ص:۳۶]

طوفان بھی ہواؤں سے کھا جاتے ہیں شکست
رب سے جو لو لگی ہو تو بجھتے نہیں چراغ

[ص:۳۸]

جل جائیں تو ہوا سے بُجھائے نہ جا سکیں
اور اُس کا ہو نہ حکم تو جلتے نہیں چراغ

[ص:۳۹]

جسم و جاں کو روشنی دے اُس کی رحمت کا چراغ
خلوت و جلوت میں روشن ہو اطاعت کا چراغ

[ص:۵۰]

ریاض ندیم نیازی نے اپنی حمد میں ردائف سے معنوی حُسن پیدا کیا ہے۔ موصوف نے ایسے ردیف استعمال کیے ہیں کہ اُن کی حمد میں فکری حوالے سے وسعت پیدا ہوئی ہے اور معنویاتی تنوع بھی نکھر کر سامنے آیا ہے۔ اِن کی ایسی ردیفیں حمد میں روانی اور تازگی پیدا کر رہی ہیں۔ بعض ردیف تو ایسی ہیں جو لفظی حوالے سے بھی اپنے اندر حمد و ثنا کا پہلو رکھتی ہیں جیسے 'تری شان جَلّ جلالہٗ، وہ احد ہے'، 'تیرے سوا، اس نے کہا تو ہی تو بس تو ہی تو' اور اس کے علاوہ وہ ردائف جن سے انھوں نے معنوی حُسن اور فکری تنوع پیدا کیا اُن میں کچھ یوں ہیں: آراستہ، دل کش، قبول، فروزاں، توازن، یقیں، جھلک، چراغاں، اِرتقا، چراغ، تُو، التجا، بخشے وغیرہ۔ موصوف کو فنی حوالے سے بھی حمد لکھنے اور اُسے بیان کے رنگوں سے سجانے کے لیے لفظ و معنی کا دروبست عطا کرنے والے الخالق نے خوب نوازا ہے جس سے وہ خود بھی آگاہ ہے اور اِسی آگاہی کے اُجالے میں وہ حمد و ثنا کے ایسے چراغ جلا رہا ہے جس سے روشنی اور خوش بو قارئین کو اپنی طرف بلاتی ہے۔

جب بھی کرتا ہوں تصور خالقِ کونین کا
خود ہی ہو جاتے ہیں میرے قلب و جاں آراستہ

[ص:۱۰۰]

میرے رب نے دنیا کو بخشی ہے جتنی دل کشی
کون لا سکتا ہے اِس دنیا میں ایسی دل کشی

[ص:۹۳]

کوئی کیا سمجھ سکے گا ہے دراصل کیا توازن
کسی عقل کو نہ بخشے جو مرا خدا توازن

[ص:۷۳]

ریاض ندیم نیازی کی حمد شعری محاسن سے سجی ہوئی ہے۔ موصوف نے حمد لکھتے ہوئے کہیں کوئی بھرتی کا شعر یا حمد مکمل کرنے کے لیے اشعار نہیں لکھے بل کہ اِن کی ہر حمد، حمد سکھاتی ہوئی، حمد کرنے کے فن سے آشنا حمد ہے۔ انھوں نے غور و فکر کر کے ربّی توفیق سے حمد لکھی ہے۔ اِن کی حمد کی بنیاد وہ عشق اور توحید پرستی ہے جو کہ اِن کی دعاؤں سے ظاہر ہے مگر میں نے اِن کی حمد کو تاثراتی حوالے سے پڑھتے ہوئے جو محسوس کیا ہے وہ ان کا غور و فکر اور توحیدِ خداوندی کے اظہار میں جو شعری رنگا رنگی اور فکری وسعت ہے وہ عہدِ حاضر کے بہت کم شعراء میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے فکری حوالے سے اپنی حمد کو تکرار اور معنوی حوالے سے یک سانیت کا شکار نہیں ہونے دیا بل کہ ہر لمحے فطرت اور قدرت کے بدلتے ہوئے رنگوں سے دن رات کے بدلاؤ سے ہونے والے احساس سے اپنی حمد کو سنوارا ہے۔ اِن کو اِس بات کا بھی یقین ہے کہ اُس زندہ خدا کی حمد کرنے والا اپنی تخلیق کے ساتھ ہمیشہ بستی والوں کی نظر میں عزت و توقیر پاتا ہے کیوں کہ وہ

اپنے حمد نگاروں کو، اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور ندیم نیازی کا یہ احساس کہ:

محفل میں ندیم ایک ثنا میں نے پڑھی تھی
اب سچی میں بھی میری صدا گونج رہی ہے
[ص:۱۴۳]

اسے حمد لکھنے کی طرف مائل رکھتا ہے اور یہی بات قاری کو بھی حمد کی طرف مائل کرتی ہے۔

خدائے وحدہٗ لاشریک خالق و مالک ہے۔ وہ جسے چاہے جہاں سے مرضی نوازدے۔ وہ پہلے انسان کو مانگنے کے لیے لفظ عطا کرتا ہے پھر مانگنے کے طریقے سکھاتا ہے اور کسی کو عقل کا توازن بخش کر اُسے اپنی قدرت کے رنگوں کے نورانی جلووں میں اتنا محو رکھتا ہے کہ وہ ہر وقت اُس کی حمد وثنا میں مست رہتا ہے۔ جس طرح اُس کی قدرت کے رنگ ہیں اسی طرح اُس کے بندوں کی حمد وثنا کرنے کے بھی رنگ ہیں اور ہر رنگ کا اپنا ایک منفرد اور الگ ذائقہ ہے اور یہ سب اُسی کی عطا ہے۔

اُسی عطا کا ایک رنگ ''کن فیکون'' ہے جسے ریاض ندیم نیازی نے تخلیق کیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ جب زمانے میں ہر کوئی اُسی خالق و مالک کی حمد وثنا کرتا ہے تو ہم بندے ہو کر، اُس کی تخلیق ہو کر، اُس سے محروم کیوں رہیں۔ موصوف نے اپنی حمد میں نعت کے رنگوں کو بھی بکھیرا ہے اور صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔ یعنی اُن کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے پروردگار کی حمد کا جھنڈا اُٹھائے رکھا۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی حمد کی توفیق انھی کو بخشتا ہے جنھیں وہ حمد کے لیے چن لیتا ہے۔ جو اس کی دی ہوئی عقل کو، فہم کو بروئے کار لاتے ہوئے اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ہر جگہ اُس کی نشانیوں سے اُس کی قدرتوں کو دیکھتے ہیں اور اُس کا اظہار کرتے ہیں جیسے ''کن فیکون'' کے شاعر نے کہا ہے کہ:

ہوا، بارش، دھنک، شبنم، گھٹا، بادِ صبا تیری
زمانے میں سبھی مخلوق کرتی ہے ثنا تیری
[ص:۵۷]

حقیقت میں وہ ہر دم جا بہ جا موجود ہوتا ہے
جہاں جائیں، جدھر جائیں، خدا موجود رہتا ہے
[ص:۱۴۹]

وہ سروری سے نوازے، قلندری بخشے
غلامی مانگنے جائیں سکندری بخشے
[ص:۱۶۷]

ریاض ندیم نیازی کی شاعری کا سفر جو کہ ۲۰۱۰ء میں ''خوش بو تری جوئے کرم'' نعتیہ کتاب سے شروع ہوا تھا ''ہوئے جو حاضر در نبی پر'' اور ''بحرِ تجلیات'' سے ہوتا ہوا ''جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''، ''چمن زارِ حمد و نعت'' تک پہنچا اور تقدیسی ادب میں اپنے کئی نقوش چھوڑتا ہوا آج نکھر کر ''کن فیکون'' کی صورت میں اہلِ علم و فن تک آ پہنچا ہے۔ آپ کی اس کتاب کو ماورا پبلشرز، لاہور کی طرف سے ۲۰۲۰ء میں شائع کیا گیا۔

☆☆☆☆☆

ہم کے ٹھہرے اجنبی

محترم افضل محمود صاحب کی تصنیف نما تالیف یا تالیف نما تصنیف "ہم کے ٹھہرے اجنبی" صرف اپنے ٹائٹل کی نسبت سے ہم کے ٹھہرے اجنبی ہے ورنہ اس میں کوئی بھی کردار اجنبی نہیں ہے۔

سب کردار سب گھروں میں موجود تھے اور چلتے ہوئے باتیں کرتے نظر بھی آتے تھے۔ یہ کردار میرے بچپن کی طرح رفتہ رفتہ لحہ لحہ صبح شام کی چکی میں پس پس کر اُڑتے گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے اور لوگ دیکھتے رہ گئے اور اب 78 برس میں کوئی ایک بھی کردار انوری بیگم کرم دین عبدالرزاق خان، عبدالغفور یا سید مہدی حسن شاہ جیسا باقی نہیں رہا اُن شخصیات کا غائب ہونا کسی بڑے حادثے یا سانحے سے کم نہیں۔ مگر یہ حقیقت کے ہر زمانہ اپنے ساتھ رہتے بستے چلتے پھرتے لوگوں کو روند کر آگے نکل جاتا ہے مگر زمانے کی پوری کوشش کے بعد بھی کچھ اہم زندگی سے بھرپور کردار بلکہ بذات خود زندگی ہونے والے کردار کبھی روندے نہیں جاتا افضل محمود صاحب نے ''ہم کے ٹھہرے اجنبی'' میں ایک سو بارہ صفحات پر صرف 13 شخصیات سے ایک پورے معاشرے کو ظاہر وا جاگر کردیا یقیناً یہ ایک کارنامہ ہے۔

افضل محمود صاحب اگر ان کرداروں کے راوی حضرات کا حوالہ نہ بھی دیتے تب بھی یہ ایک مکمل تخلیق ہوتی مگر جس سچے زمانے کی سچی ترین شخصیات کا اس تصنیف میں تذکرہ ہے اس کا تقاضا یہی تھا کے فاضل منصف افضل محمود خود بھی صادق امین ہونے کا ثبوت دیتے سو انھوں نے یہی کیا اور ثبوت دیا کے راوی کی بیان کردہ ہر بات کو جوں کا توں بیان کر دیا، حالانکہ نمک مرچ تو ہر مصنف کے پاس ہوتا ہے اور وہ بقدر ظرف ادبی ہانڈی میں ڈالتا بھی ہے مگر

اعجاز رضوی

افضل محمود صاحب نے ایسا نہیں کیا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ نمک مرچ کے ساتھ کچھ کھٹا بھی ڈال دیتے تو یہ تصنیف ایک ادبی حوالہ بن جاتی۔

اور شخصی خاکہ نگاری آٹو بائیوگرافی یا لائف اسکیچ کے دائرے کو مزید وسعت اور وضاحت عطا کرتی۔

مگر اس کے بغیر بھی یہ تصنیف ہم کے ٹھہرے اجنبی ''ایک مکمل کرداری خاکہ نگاری آٹو بائیوگرافی یا لائف اسکیچ کے معیار پر پوری اترتی ہے کہ اس کے تمام راوی جہلم چناب ستلج کے کنارے بستے ہیں۔

ہم کے ٹھہرے اجنبی میں، کہیں بھی کسی بھی راوی نے اپنے بیان کردہ کردار یا شخصیت کو پنجابی جگت یا فقرے بازی سے دور رکھا ہے اور کردار کو یوں سنانا ہے یا بیان کیا ہے کہ سب کے سب کردار کسی اور دنیا کے باسی لگتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ بہت کم کے منہ میں زبان تھی سو ان اعلیٰ شخصیات کو پڑھتے پڑھتے قاری کا دل غم سے بھر جاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ کاش پاکستان کی سرزمین پر گزشتہ 78 برس میں کوئی ایک سیاسی کردار یا شخصیت ان تیرہ شخصیات یا کرداروں کی طرح سامنے آتی تو آج کے پاکستان کا یہ حال نہ ہوتا کے ایٹم بم سامنے رکھا ہے اور تقریباً 26 کروڑ لوگ گھومتے پھرتے خاموشی سے کبھی امریکہ کبھی چین کبھی سعودی عرب کی طرف دیکھتے ہیں کاش کوئی شخصیت کرم دین یا عبدالرزاق یا انوری بیگم سے ملتی جلتی ہوتی تو کم سے کم پورے پاکستان یا صرف پارلیمنٹ میں تو اتنی تعداد ہوتی کے ہم یقین سے کہہ سکتے کے آنے والے کسی سال میں بہت جلد عائشہ بیگم میاں محمد اکبر، فضل بی بی، رانا محمد اکرم، میاں کریم بخش، اللہ دتہ دیدیو، عبدالغفور، چودھری محمد اسلم، میاں منظور محمد جیسا کوئی نہ کوئی رکن پارلیمنٹ آئے گا اور وزیر اعظم بن کر میدان میں پڑی عوام کی پنسل واپس کر دے گا کوئی جج فیصلہ سناتے ہوئے سفارش آنے پر استعفیٰ دے دے گا کوئی سچا جھوٹی گواہی سے انکار کر دے گا اور سچ کا ساتھ دے گا کوئی مہاجر ہونے کا احسان نہیں جتائے گا کوئی پرمٹ کے بغیر غریبوں کی لکڑی نہیں اٹھائے گا۔ کوئی بچوں کو اعلیٰ عہدے پر دیکھ کر دولت کی کہانی نہیں سنائے گا۔

کاش، اس کتاب میں موجودہ تیرہ زندہ و جاوید شخصیات کی صرف ایک ایک خوبی ہماری تیرہ مقتدر شخصیات کو مل جائے تو سمجھیں پاکستان بن گیا۔

اگر ایسا ہوا تو میں سب سے پہلے یہ مصرع اٹھاؤں گا کہ - ہم تو ٹھہرے آشنا تیرہ ملاقاتوں کے بعد اور پھر نعرہ لگاؤں گا کہ

محترم افضل محمود ___ بمعہ راوی زندہ باد

تیرہ زندہ شخصیات، پائندہ باد

☆☆☆☆☆

''دغم ورثہ ہے'' [ناولٹ]

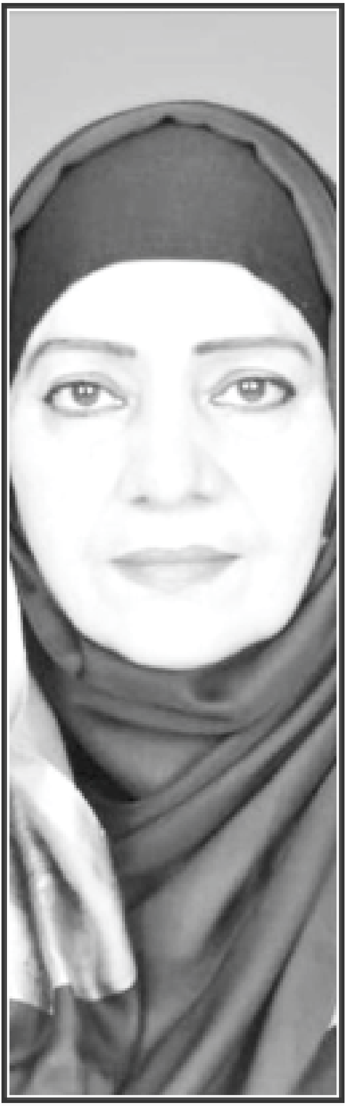

دردانہ نوشین خان

فون بند ہو گیا ثمینہ تا دیر ثانیہ کی باتوں کو دل میں دہراتی رہی۔

آج وہ اپنی تنخواہ 16930 روپے وصول کر کے گھر تک پہنچنے تک ان کی ملکیت کی خوشی محسوس کرتی اپنے دھیان میں کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ سامنے موٹر سائیکل آنے کے سبب کھیت میں اُترنا پڑا موٹر سائیکل والا دیکھا بھالا لگا وہ جس نے زبردست اپنا نام بتایا تھا۔ اُس نے رفتار دھیمی کر دی سلام کر کے حال پوچھا۔

''میری بھی ایک بیٹی ہے میری بھابی کے پاس ہوتی ہے''

''بھابی کے پاس؟''

''جی وائف کی ڈیتھ کے بعد۔''

''سُن کر افسوس ہوا۔'' اُس نے قدم بڑھا دیا۔

''پانچ سال ہو گئے۔'' اُس کی بات رہ گئی۔ راستے میں کچھ لوگ آ گئے۔

ثمینہ کو لمبی بات کرنے پہ افسوس ہوا پھر یاد آیا ثمامہ امام کے کپڑے ضروری ہیں۔ بازار سے ہوتے ہوئے جاتی ہوں گھر میں گئی تو سارے پیسے چھین لیے جائیں گے۔ بڑی دُکان حاجی بزاز کی ہوتی تھی۔ وہاں سے بچیوں کے لیے گرم کپڑے کے پیس لیے۔ ایک ہزار کی سیل والا لینن کا ایک جوڑا اپنے لیے لیا۔ ثمامہ کی

کے لیے بھی ایک قمیض کا کپڑا لیا ورنہ اُس کا مزاج برہم ہو جاتا تھا۔ بچوں کے لیے کیلے اور بسکٹ لیے۔ دیر ہو چکی تھی تیز تیز چلتی گھر پہنچی۔ کل تک جو تم بیزار کرنے والا خاوند دروازے میں کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

"اتنی دیر کر دی، کہاں رہ گئی تھی" اُس کے ہاتھ میں شاپر وہ دیکھ چکا تھا۔

"تنخواہ مل گئی؟ لاؤ پیسے دو میں نے پرچون والے کے دینے ہیں۔"

"سانس تو لینے دو..... پرچون والا بھاگا نہیں جا رہا" اُس نے چادر اُتاری۔

"آواز سُن کر بجو نے جملہ کسا۔

"اب آ رہی ہو۔ مغرب ہونے والی ہے۔"

شامہ دوڑتی ہوئی ٹانگوں سے لپٹ گئی چھوٹی امامہ پلنگ پر کسمسانے لگی۔ ثانیہ نے دونوں کو کیلے دیے۔ دو کیلے بجو ماسی کو دیے۔ پھر بتایا کہ حاجی بزاز تک گئی تھی۔ "بچیوں کے کپڑے لیر لیر ہو رہے تھے۔" بجو کیلے اور اپنا کپڑا پا کر ٹھنڈی ہو گئی مگر مجید کو اُس کا پیسے خرچ کر دینے کا اعتماد غصہ بھڑکا رہا تھا۔

"یہاں اتنے خرچے پڑے ہیں۔ تُو نے مجھ سے بازار جانے کی اجازت لی تھی۔"

آج بازار گئی تو کل بازارِ حُسن جاؤ گی۔"

"فضول کچھ خرچ نہیں کیے۔ بحث نہ بڑھاؤ" پرس کھولتے ہوئے پوچھا

"کتنے دینے ہیں پرچون کے"

مجید نے پرس چھین کر بقایا نوٹوں کا رول نکال لیا۔ پرس اُچھال کر پلنگ پہ ڈالا، دو کیلے اُٹھائے چھیل کر منہ میں ڈالتا باہر نکل گیا۔

ثمینہ کس کس بات پر ماتم کرتی اُس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ بچیوں کو بسکٹ دے کر چائے بنانے چلی گئی۔ پرس میں 100 روپے تھے اور مہینے کی 2 تاریخ تھی۔

رات کو جب ذہنی جسمانی طور پر تھکی ہوئی بستر پر آئی تو مجید امنہ سے کباب پیاز اور سستے نشے کے بھبکے اُڑاتا کپڑوں سے سگرٹ کی بدبو پھیلاتا اُس کے لحاف میں گھسنے لگا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں تھکی ہوئی ہوں۔ میں تم سے بیزار ہوں۔"

"گناہ گار عورت خاوند کا حق جھٹلائے گی جہنم میں جائے گی۔"

"خاوند کا حق خاوند کے فرائض کے بعد آتا ہے۔ میری تنخواہ کا ایک ایک روپیہ چھین کر تم بتانے کے روادار نہیں سارے پیسے کہاں گئے تمھارے دو بچوں کو میرا باپ پال رہا ہے دو کا کپڑا لتا کوئی ضرورت کی چیز کبھی تم نے؟"

"کتی کمینی..... سدا کی بدزبان..... موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ تجھے چھت دے رکھی ہے عزت سے رہتی ہے۔ روٹی نہیں ملتی۔ دفعہ ہو پرے مر۔"

اس زور سے کمر میں دھموکہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر امامہ پر جا پڑی۔ بچی چیخ کر روئی۔ اُسے اُٹھا کر وہ بستر سے اُتر گئی۔

''مجھے..... تم سے نفرت ہے مجید..... میں تم سے نفرت کرتی ہوں''

''جاماں کے یار کے پاس..... میں نے مجھے طلاق دی..... نکل جا..... میں بھی اس چخ چخ سے زچ گیا ہوں..... صورت نہ شکل نخرے آسمان تک..... چپی بوتھی'' وہ اپنی رضائی اُٹھا کر ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ ثمینہ نے کمرہ اندر سے بند کیا اور آرام سے سوگئی۔

صبح یاد آیا طلاق ہوگئی ہے پانی گرم کر کے وضو کیا فجر کی نماز ادا کی۔ سلام پھیر کر بچیوں پر پھونکا۔ امامہ کے لیے دودھ گرم کرنے باورچی خانے میں گئی۔ سجو آٹا گوندھ رہی تھی۔ فیڈر میں دودھ ڈال کر ہلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آپ کو پتا ہوگا آپ کے بیٹے نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرے لیے اب یہاں رہنا حرام ہے۔ میں آج بچوں کو لے کر امّی کے گھر چلی جاؤں گی۔

''بیٹھ جا..... بیٹھ میرے پاس..... مرد غصے میں آکر بک دیتے ہیں۔ یوں گھر نہیں توڑ دیا جاتا۔ پاگل نہ بن''

''طلاق غصے میں ہی ہوتی ہے۔ ہوگئی تو ہوگئی۔''

''ایک بار کہہ دینے سے کچی طلاق ہوتی ہے۔ چپ کر کے بات پی جا کسی کو نہ کہنا۔ دو چار دن بعد ترے پاس آجائے گا..... چار بچوں کو لے کر کہاں دربدر ہوگی۔ سمجھانے کی بات کر رہی ہوں..... رات کو یہی بات کر رہا تھا مجھے دیکھ کے منہ سُجا (پُھلا) لیتی ہے ذرا ہنس بول لیا کر، بن سنور کر رہا کر.....''

یہی ہے ہمارا سماج، سوا، خدمت، سنگھار، صبر سب عورت کے سر منڈھ دو۔ وہ دفتر جارہی تھی مگر دماغ گھوم رہا تھا۔ قدم رکھتی کہیں اور پڑتے کہیں، رُکی تو خود کو پرانے کھوہ (کنویں) کے پاس پایا کنویں کی منڈیر تک جاکر نیچے جھانکی تہہ میں کالا پانی چمکتا تھا۔ سوچا بھاگ کے جاؤں ثمامہ۔ امامہ کو لے آؤں..... پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ پلٹ کر تیزی سے واپسی کی جانب چلی ہی تھی کہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''آپ یہاں..... کیا کر رہی ہیں؟ کچھ گر گیا ہے کیا.....''

''آپ سمجھدار انسان لگتے ہیں۔ کیوں میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔''

''میں پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ پلیز آپ بُرا نہ منائیے۔ آپ کو کوئی بڑی پریشانی ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہیں۔''

''اس بھروسے سے مجھے کیا مل جائے گا'' وہ آگے بڑھ گئی۔

وہ الھڑ دوشیزہ نہیں تھی۔ دبلی پتلی نکلتے قد کی سیاہ چادر لیے کالے پمپ شوز میں روزانہ اپنے گھر کے میدان کو پار کر (وہی میدان یہاں اُس کی بارات کی بس رُکی تھی) پیدل مرکز صحت جاتی۔ خاوند گھر پر سویا ہوتا یا باہر دوستوں میں ہوتا۔ سرما کی صبحیں اور گرما کی دوپہریں ویران ہوتیں مگر اُس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

رات کو چھوٹی بچی امامہ کو سردی سے بخار ہو گیا۔ ثمینہ نے سیرپ پلایا۔ شہد چٹائی اپنی سی کوشش کرتی رہی۔ گود میں لیے جاگتی رہی۔ بچی کے رونے، ثمینہ کے اُٹھنے بیٹھنے سے بے نیاز مجید کانوں پر لحاف لپیٹ کر بڑبڑاتا۔

"اسے کیا مصیبت ہے۔ چپ کیوں نہیں کرتی"

"بخار سے تپ رہی ہے کیا کروں۔"

"میں تو اماں کے کمرے میں سونے جا رہا ہوں۔ صبح ہو تو دوا لے آنا۔"

وہ لحاف اُٹھا کر نکل گیا۔

جس کو صبح ڈیوٹی جانا ہوتا تھا اُس کے ذمے جاگنا تھا جسے دن رات سونا تھا اُس کو تھکاوٹ نہ ہو۔"

جیسے ہی دن روشن ہوا ثمینہ امامہ کو کمبل میں لپیٹ کر ہجو ماسی کے پاس آئی۔ "ساری رات روتی رہی ہے۔ تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے چلو" ماسی ہجو مجیدے کو آواز دینے لگی اُس نے کروٹ بدلی اور سو رہا۔ آخر دونوں چل دیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ثمینہ کا سٹاف ممبر ہونے کی وجہ سے ناوقت آمد پر بھی بھرپور توجہ دی بچی کا بخار کم کرنے میں کافی دیر لگی پھر اسے ڈرپ لگائی گئی۔ دو گھنٹے مزید لگنے تھے ثمینہ نے ہجو ماسی کو مجید کے ناشتے کی وجہ سے بھجوا دیا۔

دوائی مفت مل گئیں۔ مزید دوائیں اور دودھ کا ڈبہ (جو لکھ دیا گیا تھا) منگوانا تھا۔ دودھ کے ڈبے کے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ علی پور سے کون لائے گا۔ پہلی بار بے تکا خیال آیا شہر یار جو یہ نظر آ جائے تو اسے کہے دودھ کا ڈبہ لا دو۔

وہی ہوا۔ ڈبے پر تکرار ہونے لگی۔ ڈاکٹر تو یوں ہی لکھ دیتے ہیں۔ مہنگا ہے اسی دودھ میں سونف الائچی ڈال کر ابال لیں گے۔ نوید کو بھابی کی مجبوری صورت پر ترس آ گیا۔ (مجھے پیسے دو بھابی۔ میں لا دیتا ہوں۔"

"مجید...... ابھی ہفتہ پہلے تم" پندرہ ہزار لے گئے تھے۔ اس میں سے ایک ڈبہ اپنی بیٹی کے لیے خرید لاؤ...... میں منت کرتی ہوں۔"

"لو...... اس کی بات سنو۔ اماں نے بجلی کا بل بھروایا۔ اُدھار چکائے۔

اب گن گن کر بتاؤں کہاں خرچ ہوئے۔" وہ درشتی سے بولا۔

پس روزمرہ والا دودھ دیا گیا۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔ دوسرے دن بچی ٹھیک رہی۔ رات کو وہ اور ثمینہ سکون سے سوئیں۔

تیسرے دن محکمہ صحت کے افسر معائنہ کرنے آ رہے تھے۔ ثمینہ ہجو خالہ کو ہدایات دے کر نوید کو دوائیں سمجھا کر ڈیوٹی پر چلی گئی اں

مرکز دیہی صحت و زچہ بچہ سنٹر پر غیر معمولی صفائی اور بھاگ دوڑ کا منظر تھا۔ چوکیدار وردی میں تھا۔ چھڑکاؤ اور چونے کی لکیر لگی ہوئی تھی۔ نسیمو کو مریض عورتوں کی قطار بندی اور پرچی بنانے کے لیے بلا لیا گیا تھا۔ ثمینہ نے بھی دفتر سے ملحق سٹاف روم میں ایمرجنسی میں پہنا جانے والا مشترکہ سفید اوورکوٹ پہن لیا۔

افسران کی آمد، فارمیسی کی ادویہ کی جانچ پڑتال، دیگر دفتری امور میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ افسران رخصت ہوئے۔ عملے نے سکھ کا سانس لیا۔ اتنے میں ثمینہ کی پڑوسن ریحانہ باجی کا بیٹا تیزی سے آتا دکھائی دیا۔

"ثمینہ باجی...... جلدی چلیں، جلدی کریں"

"کیا ہو گیا ہے؟ خیر تو ہے" مڈوائف اختر بی بی نے پوچھا

"امامہ کو کچھ ہو گیا ہے۔"

"ہائے اللہ" ثمینہ نے گاؤن اتار کر پھینکا۔ چادر اوڑھتے پوچھنے لگی "بخار تیز ہو گیا ہے؟ رو رہی ہے؟ تم لے آتے...... خالہ تجو سے کہتے۔"

"آپ موٹر سائیکل پر بیٹھیں......" اُس کے بیٹھتے ہی سٹارٹ کر کے بولا

"باجی...... امامہ مر گئی ہے باجی۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔ بکواس کر رہو صبح اچھی بھلی کھیل رہی تھی۔ دو سویٹر کے اوپر جیکٹ پہنا کے آئی تھی۔ دو جرابیں پہنائی تھی۔ اُسے سردی نہیں لگ سکتی۔" وہ گھر کی دہلیز تک بولتی گئی۔

گھر کے باہر مرد جمع تھے۔ نوید چار سالہ بھتیجی ثمامہ کو اُٹھائے کھڑا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اندر تجو ماسی کے اردگرد عورتوں کا جھمگٹا تھا ثمینہ نے لپک کر تجو ماسی کی گود میں امامہ کو لیا۔ اُس یقین تھا دیہاتی لوگوں نے بیمار بچی کی غنودگی کو مُردہ قرار دے رکھا ہو گا۔ ثمینہ نے اُس کے منہ میں سانس پھونکے "اس کا بدن گرم ہے...... ماسی اسے ڈاکٹر......"

"اڑی ثمینہ، میری پوتی کو تنگ نہ کر۔ میری بچی اب نہیں رہی" تجو ماسی بین کے انداز میں بول رہی تھی۔

"نوید...... نوید......" ثمینہ نے دیور کو زور سے آواز دی۔ "جلدی سے ڈاکٹر صاحب کے چل، ابھی چل تجھے اللہ کا واسطہ......"

نوید نے ثمامہ کو اُتارا...... "جی بھابی...... آؤ لے چلتا ہوں" اُس نے بسم اللہ کہہ کر بے حس وحرکت امامہ کو کمبل میں لپیٹ کر اُٹھا لیا۔ اور وہ دونوں نکل گئے۔ جاتے سے ثمینہ کو جو اضطراب، جوش اور جلدی تھی، آتے سے مُردے کی گود میں مردہ تھا۔ وہ گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ چل رہی تھی کوئی لڑکی دوڑتی ہوئی اُسے موبائل دے کر بولی

"بھابی تری اماں کا فون ہے۔"

وہ لڑکی موبائل پکڑے اُس کے کان سے لگائے ساتھ چل رہی تھی کیونکہ اُس کے بازوؤں میں مری ہوئی بیٹی تھی۔

"امی...... میری بیٹی مر گئی ہے۔ امی تری بیٹی کیوں نہیں مرتی...... اللہ کرے تری ثمینہ میری امامہ کی طرح مر جائے تجھے پتا چلے......"

امامہ کی موت پر اظہر بھائی، علیشا اور ابا آئے تھے۔ امی کے گردے میں درد تھا وہ ایک رات گزار کر ثمینہ کو نوٹ دے کر چلے گئے۔ اُن کی جانب سے مداوا، تشفی، تعزیت نوٹ تھے۔

امامہ کیسے مر گئی؟ اس سوال کا جواب ثمینہ کو نہ ملتا

تھا- وہ تھی سوجھ بوجھ رکھتی تھی- سوال کا اُٹھنا اُس کی تعلیم اور حجاب کا حصّہ تھا مگر جواب ملتے

"بس اُس کی آئی ہوئی تھی"

"دو گھنٹے پہلے تک اچھی بھلی کھیل رہی تھی"

ایک ہفتہ بعد ثمینہ کمرے کی چیزیں سمیٹ رہی تھی- امامہ کی بچی ہوئی دوائیں شاپر میں ڈالنے لگی تو پاس ٹھہری شامہ نے ایک شیشی اُٹھا کے کہا

"امّی ...... یہ شیشی پلائی تھی ...... نیلے ڈھکن والی امامہ کا نیلا فراک تھا"

"کس نے پلائی تھی تو یہ چاچو نے؟"

"نہیں ......ابّو نے ...... دو چمچے پلائے تھے-"

"کیا؟ دو چمچ؟"

"ہاں"

"یہ رہا ...... امّی ...... یہ پڑا تو ہے یہاں" وہ چمچ دکھانے لگی ____

"یہ صرف تین قطرے دینی تھی- اس کا ڈراپر ساتھ رکھا تھا، کہاں ہے ......"

وہ اِدھر اُدھر تلاش کرتے حواس باختہ ہوئے جاتی تھی-

"یہ دو چمچ پلا دیئے ...... اس کا ڈراپر کیسے اُترا؟"

وہ دوائی کی شیشی، چمچ اور شامہ کو بازو سے پکڑے صحن پار کرکے بجو ماسی والے کمرے میں گئی- بجو ماسی سر پہ دوپٹہ باندھے لحاف میں بیٹھی میوے والا گُڑ کھا رہی تھی- کمرہ کافی بڑا تھا کمرے کے پرلے کونے میں معذور باپ کا کھٹولا تھا- اُس کی کم ہی پرواہ کی جاتی تھی- ماں بیٹا وہیں کھاتے پیتے رہتے- ثمینہ نے مجیدے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا-

"یہ دوا ...... یہ شیشی ...... یہ تھی نا جو تُو نے اُسے آخر بار دی ...... کتنی دی تھی؟"

"پھر ...... پھر کیا ہُوا؟" مجیدا بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا-

میں پوچھ رہی ہُوں- "کتنی دی تھی دوا؟"

"اب کیا یاد ہوگی- دی ہوگی جتنی لکھی ہوگی" بجو ماسی بیزار ہوگئی-

"بجو ماسی، آپ چپ رہیں ...... شامی بیٹا ...... ابّو نے دوا کتنے چمچ دی تھی امامہ کو"

"دو ...... وہ سہم گئی-

"یہی چمچ تھا ناں؟" شامہ نے سر ہلایا-

"یہ باؤلی ہے- اس کو کیا پتا، دوا تھی زہر تو نہ تھی- زہر تھی تو تُو کیوں لائی تھی، مجید گُڑ والا ہاتھ جھاڑتا ہوا اُٹھا-

"یہ دوا صرف تین قطرے دینی تھی- ڈراپر بھر کر تین قطرے ...... ڈراپر میز کے نیچے مٹی پر پڑا ملا مجھے-"

اس کے لہجے کی سنجیدگی میں کسی خطرے کی بُو سونگھ کر وہ بات کو سختی سے دبانے کے لیے اونچی آواز میں چلایا-

"تُو یہ کہنا چاہتی ہے میں نے اپنی بچی کو جان بوجھ کر دو چمچ میں نے بخار والے سیرپ کے پلائے تھے-

تُو اس تدی کی بات پہ بھروسہ کرتی ہے مجھے

گنوار سمجھتی ہے۔"

"اُسے کچھ نہ کہو، آرام سے میری بات سُنو۔ بخار والا سیرپ میں نے سٹول پر رکھا تھا۔ یہی شیشی الگ شوکیس پر رکھی اور ساتھ ڈراپر رکھا...... اس کے پاس چیچی کیسے آ گیا...... اور نوید...... دوائیاں میں تمہارے ذمے لگا گئی تھی"

"بھابی۔ میں باقی دوائیاں اپنے حساب اور وقت پر دے کر شاکر کے بلانے پر گیا تھا۔ مجید تجھے بتا کے تو گیا تھا بس یہ تین ڈراپس دیئے ہیں۔"

"ہاں تو......"

مجید کے چہرے پر لکھا تھا وہ اپنی غلطی جان چکا ہے مگر الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

"تُو تو ایسے جرح کرنے آئی ہے جیسے میں نے منصوبہ بنا کے بیٹی کو مارنا ہے مارتا ہوتا تو تجھے مارتا...... اماں! دیکھ یہ جگہ جگہ اس بات کو پھیلائے گی۔"

"کیوں پھیلائے گی۔ نہیں بتائے گی۔ بس کر رولا نہ ڈال۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"ماسی! دیواروں کو کیا پڑی میرے دُکھوں کو کان لگائیں۔ جان کر نہیں کی تھی تو بھی مہلک غلطی کی ہے...... اللہ سے معافی مانگنے کے بجائے مجھے گالیاں نکال رہا ہے۔"

"تُو وڈی سمجھ والی، میری غلطیاں نکالنے والی، تجھے تو میں گنوار کے سوا کچھ نہیں لگتا۔ ترا یار ڈاکٹر ہوگا...... تُو یہ بتا تو فرید کے ساتھ کیوں جاتی ہے۔ تُو دوائیاں خرید کر سمجھا گئی۔ تری نیت سب جانتا ہوں"

اس گھٹیا الزام پر ثمینہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"گنوار کے سوا تُو کچھ ہے؟ نہ حیا لحاظ نہ بولنے کی تمیز نہ رشتوں کا پاس، نوید میرے مظہر بھائی جیسا بھائی ہے۔ تُم کیا جانو دل کی پاکیزگی نماز نہ قرآن نہ محنت کی حق حلال...... نشہ، سگرٹ، گالیاں بس"

مجید بپھرے جانور کی طرح اُس پر پل پڑا۔ طمانچے مارے بالوں سے گھسیٹا۔ شامہ "میری امی...... کر کے رونے چلانے لگی۔ نوید چھڑانے کو لپکا۔ سجو ماسی دہائیاں دینے لگی۔ کھٹولے پہ پڑا معذور باپ "اس کنجر...... وحشی ہے کو پکڑے کوئی" کی آوازیں دے رہا تھا۔ مجید کسی نہ کسی طرح کمرے میں جلتی آگ کی انگیٹھی میں ثمینہ کو گھسیٹ کے ڈالنا چاہتا تھا۔

"کتا، حرامی، اسفل، بدتر جہنمی مجھے طلاق دے۔ میری جان چھوڑ...... مر جا کہیں ٹرک کے نیچے آ کر......"

مجید نے ایک جھٹکے سے ثمینہ کو دیوار پہ دھکا مارا۔ ماتھے سے خون کی لکیر بہنے لگی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

"میں نے تجھے طلاق دی، ایک بار نہیں سو بار دی...... کُتیا چل نکل"

تھوک اُڑاتا ہانپتا مردانیت کی نہیں حیوانیت کی بدصورت ترین شکل یہ مجید تھا۔

بکھرے، نُچے ہوئے بال، طمانچے زدہ لال چہرہ، قمیض کا کندھا نکلا ہوا، پھولی ہوئی سانس...... چہرے پہ لہو اور آنسو کی

لکیریں...... یہ ثمینہ تھی۔
''میری شامہ دے۔ میں رہنا نہیں چاہتی۔'' وہ اُٹھی ہوئی لڑکھڑائی۔
''شامہ کو تو ہاتھ لگا کے دکھا۔ چار ٹوٹے کر دوں گا۔''
اُدھر شامہ بھاگ کے ماں کی ٹانگوں کو لپٹ گئی اتنی ہی تیزی سے مجید نے اُسے کھینچ کے دبوچ لیا۔
نفرت سے اُٹھے ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ سب سمجھ گئے آج کھیل ختم ہے ثمینہ نے زمین پر پڑی شال اُٹھائی اور جو ماسی سے مخاطب ہوئی۔
''علیشا کی ماں...... تری دھی میرے باپ کے گھر رہے آباد...... میرا زیور کپڑا لتا سب ترا۔ اپنی تربیت کے فرعون یزید سے کہہ میری بیٹی مجھے دے دے۔''
''تو اسے پیچھے سے لائی تھی'' دانت کچکچا کے بولا ''تو نے اسے پیٹ میں رکھا تھا''
فرید نے مجید کو کاندھے سے پکڑ کر سمجھایا ''جو کرنا تھا تم نے کر لیا بچی بہت چھوٹی ہے ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ قانون بھی اس عمر کا بچہ ماں کو دیتا ہے۔''
''قانون شانون چھوڑ...... مجیدا میری بات سُن، اِدھر آ کے بیٹھ...... عقل سے کام لے'' جو ماس کچھ بول رہی تھی مجید نے اُس کی بات پر کان نہ دھرا
''یہ میری اولاد ہے...... اس کا بازو دے کر دُلہن لاؤں گا (اس کا رشتہ دے کر بدلے میں دُلہن لاؤں گا)'' وہ للکارا۔
''تج لعنت ہے مجیدے ترے جمن تے لعنت (ترے پیدا ہونے پہ لعنت)
''پانچ سال کی بالڑی ہے۔ تجھے شرم حیا نہیں'' باپ نے کہا۔
ثمینہ نے شامہ کا ہاتھ پکڑا تو مجید نے پاؤں سے جوتا اُتار لیا۔
''نکل تو گھر سے حرامداری...... ابھی تک کھڑی ہے''
''مجید...... مجھے میری بیٹی دے دے۔ میں ابھی نکل جاؤں گی''...... مجید نے سختی سے شامہ کو دبوچا وہ روتے روتے نیم بے ہوش ہو رہی تھی۔ نوید نے بچی مجید کو دھکا دے کر لے لی۔
ثمینہ اب نوید کے پیروں گر گئی۔
''نوید...... تجھے اللہ رسول کا واسطہ ہے۔ مجھے دے ابھی اس گھر سے چلی جاؤں گی چاہے رات ہے چاہے سردی ہے، خدا کی قسم چلی جاؤں گی''
مجید ایک بار پھر ثمینہ پر حملہ آور ہو گیا۔ ثمینہ فٹ بال کی طرح پٹ رہی تھی شاید وہ دم توڑ دیتی۔ نوید کے اختیار میں کیا تھا وہ چادر کھینچ کر ثمینہ پہ پھینکتے ہوئے بولا۔ ''اماں بھابی کو دُور لے جا۔'' یہ درندہ اُسے مار دے گا......'' پھر وہ آنسو سے بھری آواز سے بولا...... ''بھابی جب تک میں اس کا چاچا زندہ ہوں...... اس کا خیال رکھوں۔ تم جاؤ......''
جو اُسے سنبھالتی باہر لیے جا رہی تھی۔ دونوں بھائی گتھم گتھا تھے۔
پیچھے محشر بپا ہو گیا تھا۔

[جاری ہے۔]

کوئی طرحِ مزاحمت کیسی

"نظم جس بات سے ہوئی آغاز
اگلی ساری سطور میں اس سے
ربط معنی کی جستجو پیچھے
تم ابھی تک وہیں رکے ہوئے ہو
کن زمانوں کے آدمی ہو تم
کچھ خبر ہے کہ حرف و فن کا سفر
کس نواحِ جدا تک آ پہنچا
کیسی منطق کدھر خیال کی رو
کیوں تلاشو کسی دیے کی لو
راکھ ٹھہرا زرِ ہم آہنگی
کیا تسلسل کی رجعتی خواہش
عجزِ اظہار کا گلہ باطل
شرطِ متنِ وقیع کارِ عبث
جو بھی قرطاس پر لکھا ہو بس
اس کو لازم ہے معتبر جانو
یہ تو تعبیر کا کرشمہ ہے
کوئی کچھ بھی نکال سکتا ہے
جتنا ابہام اتنی گہرائی
(جیسی جس کے گمان میں آئی)
حیف اتنا تمھیں شعور نہیں
معنی کرتے ہیں کب قیام کہیں"

ہر رہِ فکر کا ہے اپنا مآل
سو سبھی دردمند سینوں بیچ
سر اٹھاتا ہے یہ سلگتا سوال
زور و جبر و ستم کی دنیا میں
ہو جو نقد و نظر کی خُو ایسی
کیا روایت قیام کرنے کی
کوئی طرحِ مزاحمت کیسی

جلیل عالی

تشکیک

دیکھنا چاہا تھا ماضی میں ذرا جھانک کے
اِک دن مَیں نے
تا کہ معلوم مجھے بھی ہو کب آغاز ہوئی تھی دُنیا
گرچہ کچھ کچھ مجھے یاد آتا تو ہے
میں نے سُنا تھا وہ دھماکہ شاید
جس کو بگ بینگ کا عنوان دیا جاتا ہے
اور ممکن ہے سماعت میں کبھی کُن
فَیَکوں کی بھی صدا آئی ہو
پھر بھی اِک دائرہ تشکیک کا گھیرے
ہوئے رہتا تھا مجھے
اس لئے جھانکنا چاہا تھا ذرا ماضی میں

☆

آلۂ وقت کی ایجاد ہوئی جب تو میں سمجھا کہ
مری مُشکلیں آسان ہوئیں
لیکن افسوس، یہ کوشش مری ناکام رہی
آلۂ وقت کی کُل کوئی غلط دب گئی مجھ سے شاید
اب مرے سامنے منظر ہے جو ماضی کا نہیں،
وہ تو ہے مستقبل کا
جس میں ہر چیز پہ ہے گہری سیاہی حاوی
کوئی جغرافیہ اس میں ہے نہ تاریخ اپنی
جس طرح پھیر گیا ہو خطِ تنسیخ کوئی
لازمانی کی سیہ دھند میں گم ہے سب کچھ
ایسا لگتا ہے کہ اب تو کسی بگ بینگ کا امکان نہیں

نسیمِ سحر

درد

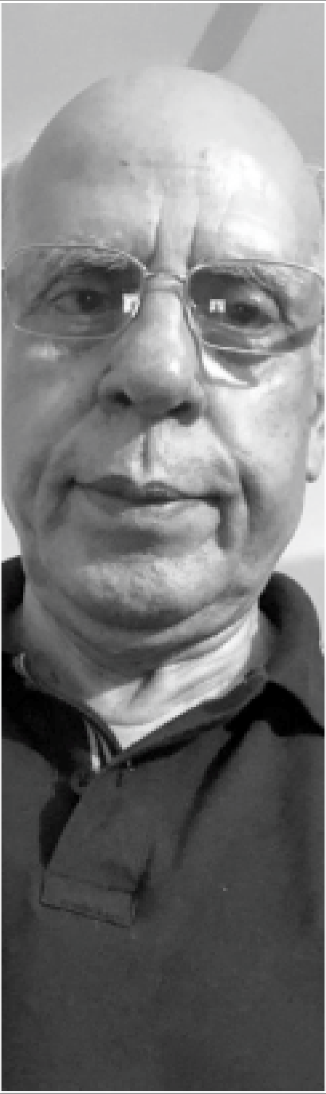

سید افسر ساجد

یہ تو ساری باتیں ہیں، باتوں کا کیا
باتوں سے کب درد بتائے جاتے ہیں
اس نے ہم کو درد دیا اور ایسا درد
جس کا ذکر کریں تو کس سے
جس کا بار سہیں تو کیسے

درد دیا اور بھول گیا وہ
خواب میں ہم سے روٹھ گیا وہ
خواب حقیقت ہوتے گر تو
درد مُصیبت بن جاتا
کس کو کس کا درد ہے یہ بھی
راز حقیقت بن جاتا!

ہم نے بس خوابوں ہی میں
اپنا درد سمویا ہے
ان میں خود کو کھویا ہے!

سیتا کنڈ پر

وہ
نہانے گئی تو مجھے دھیان آیا
کہ راوی بیچ در بیچ بہتا ہوا نسلوں میں کہیں کھو نہ جائے
آک اور کانہہ کی جھاڑیوں کی دمک میں کہیں
ڈوب جائے نہ لو میری بینائی کی
سُرخ جھڑ بیریوں کے تجاوز بھرے شاخچے
کاٹتے
جسم کو چھیدتی جنگلی گھاس کی آریاں توڑتے
قرمزی کیکروں سے اُلجھتے ہوئے
تیتروں، ککوؤں اور بٹیروں کے زیرِ
زمیں گھونسلوں کو مسلتے ہوئے
دیر ہو جائے گی
اور اس بیچ میں
رقص کرتے ہوئے پانیوں کے بھنور مشتعل ہو نہ جائیں
اور جس وقت میری ضرورت پڑے
میں پہنچ نہ سکوں

بس یہی سوچ کر
میں نے دریا کو دونوں کناروں سے پکڑا
اُسے پوری طاقت سے کھینچا
زمیں پر بچھایا
سبھی بل نکالے

تو کچھ دیر میں
رقص کرتے بھنور مٹ گئے اور دونوں
کناروں میں پانی
کسی کہکشاں کی طرح جھلملانے لگا
جس کی اُجلی صباحت کو پہنے ہوئے
اپنی کایا پہ پانی بہاتے ہوئے
دور حدِ نظر پر وہ موجود تھی

میں نے دیکھا مگر دیکھ پایا نہیں
میرا اپنا کرم مجھ کو بھایا نہیں
تو میں دریا سے منہ موڑ کر آ گیا
سوچتا رہ گیا، میں نے یہ کیا کیا؟

غلام حسین ساجد

سراب

ذہن میں کوئی خاکہ بن گیا تو کیا ہوگا!
درد کی کوئی صورت لے میں ڈھل کے گر اُبھری
کوئی صورتِ احساس نقش بن گئی آخر
شعر میں کوئی جذبہ ڈھل گیا تو کیا ہوگا

مُنتشر ہی رہنے دو تم مرے خیالوں کو
مجھ کو گُم ہی رہنے دو نت نئے سرابوں میں
دھوپ کو لرزنے دو شام کے اندھیروں میں
زندگی کو بس یونہی اک گُماں سا رہنے دو

زیست کی خرابی کا گر مجھے یقیں آیا
میں کہ چشمِ ویراں ہوں رو پڑا تو کیا ہوگا!
میں فریبِ امکاں ہوں
عالمِ عجائب میں کیوں مجھے سجاتے ہو؟
کیوں فریب کھاتے ہو؟
میں کہ اک ہیولہ ہوں مٹ گیا تو کیا ہوگا!

فیاض تحسین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہلِ زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہرِ جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

چراغِ آخرِ شب

سنو مسافر!
ابھی تھکن کے اداس رستوں سے بچ کے گزرو
یہ ناامیدی کی گرد چہرے سے صاف کر دو
ابھی تو ہم نے سفر کے آغاز کی حدیں ہی عبور کی ہیں
ابھی تو مقصد کے حاشیے ہیں
ہمارے عزمِ صمیم کی شمع ٹھیک سے بھی نہیں جلی ہے

سنو مسافر!
ہم اجنبی اور بظاہر انجان راستوں سے گزر رہے ہیں
مگر نشاناتِ راہ تو اجنبی نہیں ہیں
کہ یہ وہ روشن منار ہیں
جن کو زندگی کی بلند قدروں
عظیم انسانیت کے آدرش نے
حقیقت کی جستجو میں کھڑا کیا ہے
سلگتی آہیں "بکھرتے" آنسو
نکلتے اور بلبلاتے نوحے
لہو میں ڈوبی حیات کا ایک ایک قطرہ
پکار کر ہم سے کہہ رہا ہے
مسافرو اس سفر میں تم اجنبی نہیں ہو
مسافرو اس سفر میں ہم بھی تمہارے ہمراہ چل رہے ہیں
ہمارے سینوں نے دکھ کو کتنی طویل صدیوں کا بوجھ اٹھایا ہے
جن میں کتنے مہیب اور جاں گسل مراحل سے سامنا ہے
ہماری آنکھوں نے کتنے سقراط زہر
کی نذر ہوتے دیکھے
ہزاروں منصور سولیوں پر چڑھائے دیکھے
نہ جانے کتنے یزید آ کر ہماری چھاتی پہ
کربلائیں سجا چکے ہیں
نہ جانے فرعونیت کے کتنے پجاریوں نے
ہمارے آتش نفس لہو کی حرارتوں سے
سیاہ راتوں میں روشنی کی

ہمیں خبر ہے
یہ روشنی کتنی دیر کی ہے
لہو سے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی کتنی دیر کی ہے
کراہتے دل کی آہ سے جو غبار نکلے
وہ نور کی رو ہے یا دھواں ہے
(دھواں جو ظاہر ہے چند گھڑیوں کا
میہماں ہے)

انوار انجم

وصیت

کچھ بینرز میرے پاس پڑے ہیں
جلی حروف میں جن پہ لکھا ہے
"نیناں اتریں پار"
اک حسرت
ایک دُعا
سندیسہ
"نیناں اتریں پار"
سٹیج کی خاص نشستوں کے پیچھے
اونچی دیواروں کی
روشن روشن پیشانی پر
آویزاں کیے گئے بینرز
پھولوں کی پتیاں واری گئیں
داد و تحسین کے گلدستوں سے ہاتھ بھرے
مہمانِ خاص مدعو تھے شہر میں دھوم مچی
پنڈال سجے
دلہن کی منہ دکھلائی ہوئی
یہ بینرز اب مرے پاس پڑے ہیں
اور ان پہ اب بھی جلی حروف میں لکھا ہے
"نیناں اتریں پار"
اک حسرت
ایک دُعا
سندیسہ

ان بینرز سے کھڑکی کے پردے بنے نہیں
بستر پہ بچھائے گئے نہیں
ان بینرز کی چادر میں نے اپنے کاندھے
پہ اوڑھی نہیں
اور نیناں پار اترنے کی ضد چھوڑی نہیں
اس روز کہ جب نینوں کی ناؤ خالی ہو
اس روز کہ جب مرے ہونٹوں سے
اک آہ نکلنے والی ہو
اس نیناں پار اترنے کی اس حسرت کو
مرے پاس پڑے ان بینرز کو
اس جسم کا کفن کیا جائے
مرے ساتھ ہی دفن کیا جائے

رخشندہ نوید

سیلاب

گھر بار ، مال ، منبر و محراب چھین کر
سب کچھ ہی میرا لے گیا سیلاب چھین کر

سیلِ رواں بتا ذرا کتنوں کی جان لی
تجھ کو ملا ہے کیا مرے احباب چھین کر

کہتا ہے زندگی بھی جیو اور خوش رہو
جینے کے جو بھی تھے مرے اسباب چھین کر

ریلا تھا ایسا تند کہ لاشیں بھی لے گیا
کتبوں پہ جو لکھے تھے وہ القاب چھین کر

اک ماں نے چیخ چیخ کر اتنی دہائی دی
پانی چلا جو گوہرِ نایاب چھین کر

ہائے وہ کیا جوان تھے غرقاب جو ہوئے
ریلا گیا شباب کے سب خواب چھین کر

جبراںؔ جب وہ بچھڑا میں ساکت کھڑا رہا
یہ حادثہ تو لے گیا اعصاب چھین کر

وسیم جبران

آخر کب تک؟

وہ دیکھو
مکان
گلیوں سے بھرا شہر
شہر میں باغ
باغ میں
پھولوں کے مختلف رنگ

وہ دیکھو
پانی
پانی کا سیلاب
سُنو
بارش کی آواز
کچے گھروں سے
بچوں کی چیخ پکار
کھڑکیوں سے
نسوانی ہچکیوں کا شور

وہ دیکھو
خالی ہاتھوں میں
بے بسی کے کٹورے
غربت کے گیلے کمبل سے لپٹی
عورت کی لاش

وہ دیکھو
امدادی سامان کا جشن
خیرات کے سیارے سے
گرنے والے
سامان میں موجود
خشک دودھ کے ڈبے
کانوں میں
ڈیموں کا ساؤنڈ پروف شور
اخباروں میں
فضائی معائنے کی گونج

وہ دیکھو
مگر کب تک!
آخر یونہی
سُنتے ' دیکھتے رہو گے؟

امجد بابر

حسین یادوں کا لمحہ

رات خوشی کی ایک تھی یہ
تیری یادوں کی خوشبو
کمرے اندر بکھر چکی تھی
دل کی وادی مہک اٹھی تھی
شبنم ماتھا چوم رہی تھی
پھولوں نے انگڑائی لی تھی
چاند بھی شرمانے لگتا تھا
تیری پائل چھنک رہی تھی
میٹھے سروں نے
میرا ماضی یاد دلایا
تو مجھ کو احساس ہوا یہ
میں بھی کبھی تو
پیار نگر کا راجہ تھا
حسن کی دیوی
کی خاطر میں
انسانوں کے جنگل میں سے
تنہا تنہا ٹوٹا ٹوٹا
اپنا آپ
تلاش تھا کرتا
بوسیدہ دامن کو تھامے
اپنی کرچیاں ہاتھ پہ رکھ کر
شہر کی یوں سنسان گلیوں میں
پھرتا تھا
شب بھر آوارہ
مدت بیتی
کمرے میں اب
بند رہتا ہوں
آج کی شب
جب نیند نہ آئی
شلیف سے ایک کتاب اٹھائی
جس میں تھی تصویر تمھاری
کرسی پر جب بیٹھ کے میں نے
غور سے اس تصویر کو دیکھا
دل کی دھڑکن تیز ہوئی یوں
تیری سانسوں کی گرمی نے
طاہر میرے کان میں آ کر
چپکے سے اک بات کہی تھی
جس نے تجھ کو زندہ رکھا
اس کی خاطر
طاہر زندہ رہنا ہوگا
غم دنیا کا سہنا ہوگا
غم دنیا کا سہنا ہوگا

سید طاہر شیرازی

شورشِ سیلاب

ذہن و دل نوحہ کناں ہیں شورشِ سیلاب پر
خونچکاں نقشے ابھرتے ہیں بساطِ آب پر

سندھ اور پنجاب کی حالت بھی کافی ہے خراب
سرحد، کشمیر بھی پوری طرح ہیں زیرِ آب

پانیوں میں پے بہ پے بہنے لگی ہے زندگی
ہر قدم، ہر گام پر اب موت کی ہے برتری

جانور، انسان، پتھر، سانپ، سب پانی میں ہیں
سینکڑوں بربادیاں اس موج مستانی میں ہیں

گھر کے گھر برباد ہیں، گاؤں کے گاؤں بہہ گئے
اہلِ دل یہ بھی بلائے ناگہانی سہہ گئے

وحشتیں بھی، دہشتیں بھی ہیں وطن کے چار سُو
اس کی تعمیر و ترقی کی کسے ہے جستجو؟

زلزلوں کا، جنگ کا، بیماریوں کا دور ہے
اپنے روز و شب کا کیا انداز ہے کیا طور ہے

رنگ کلیوں کا، گلوں کی مسکراہٹ لے گئیں
تند موجیں سارے گلشن کی سجاوٹ لے گئیں

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں ارضِ پاکستان پر
کیا کٹھن ادوار آئے حضرتِ انسان پر

صبح زریں پر الم کی شام بل کھانے لگی
ناگنوں کے روپ میں پھولوں پہ لہرانے لگی

آبِ رحمت، آبِ زحمت میں بدل جاتا ہے جب
ہم گناہوں میں بسر کرتے ہیں اپنے روز و شب

پانیوں کا رُخ بدل دیں آؤ استغفار سے
قصرِ نو تعمیر کر ڈالیں حسیں کردار سے

آسماں گریہ کناں ہے، گلستاں بے حال ہے
آہوئے دل کے لیے بربادیوں کا جال ہے

مہرِ ہمت کے اجالوں سے نکھاریں زندگی
عزمِ محکم کے ستاروں سے سنواریں زندگی

آؤ سجدہ ریز ہو جائیں خدا کے سامنے
حوصلے چھوڑیں نہ ہرگز ابتلا کے سامنے

اے خدا! بس تجھ سے استمداد کے طالب ہیں
تُو کرم کر دے تو پھر مغلوب سے غالب ہیں ہم

اسقدر ہم کو غنی کر اسقدر کر ہوش مند
فیض پائے ہم سے دُنیا اسقدر کر سربُلند

ذیل دل میں کل جہاں کی نعمتوں کو ڈال دے
مالدارانِ جہاں کو ہم بھی دیں! وہ مال دے

جملہ سیلابوں سے یا رب زلزلوں سے دے نجات
جو بلاؤں سے بچا سکتی ہے وہ ہے تیری ذات

کوئی تیری مصلحت کی شان تک پہنچا نہیں
کوئی عرفانی ترے عرفان تک پہنچا نہیں

اس بلائے ناگہانی میں نہاں کچھ راز ہے
کیا تری حکمت ہے مولا، کیا ترا انداز ہے

اس تباہی میں بھی آبادی کی صورت کر رحیم
یا کریم ۔ یا کریم ۔ یا کریم ۔ یا کریم

اپنی جانب ہم کو آنے کی سدا توفیق دے
ذوقِ حیدر، شوقِ عثمانؓ رفعتِ صدیقؓ دے

دشمنِ اسلام خوش ہیں یا خدا سیلاب پر
تیرے سارے چاہنے والوں بنے ہیں نوحہ گر

آسماں گریہ کناں ہے صورتِ حالات پر
بہہ گئے ہیں کھیت لاکھوں مٹ گئے ہیں گھر کے گھر

غم زدوں کو ڈھونڈتی رہتی ہے جب رحمت تری
اے خدائے دو جہاں سُن داستانِ غم مری

اے میرے مولا، مرے آقا، مرے پروردگار
میرے پاکستان کو پھر کر دے رشکِ لالہ زار

صدقۂ سبطینؒ کر سبطین کو ، ربِّ قدیر
ظلمتوں کے شہر میں اکرام کا مہرِ منیر

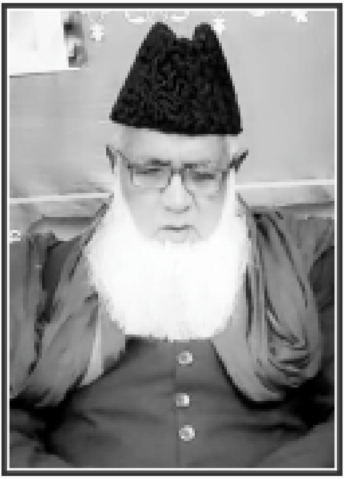

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

کیریئر

ہماری قبروں پر خودرو گھاس زرد ہو چکی
کتبوں سے موسموں نے الفاظ چھین لیے
اور تربت کے پتھر ترتیب کھو بیٹھے
ہم نے مشقت کر کے تمھیں نام دیا
لیکن تم زمانے کی دوڑ میں اتنے آگے نکل گئے
کہ تمھیں ہمارے پاس آنے کا وقت ہی نہیں ملا
روزگار اور خاندان کی دو رُخی تلوار نے
تمھیں دولخت کر دیا
مگر ایک دن جب تم دوائیوں کے تھیلے میں
قید ہو کر رہ جاؤ گے
تمھیں جیون کے جھمیلوں میں ماں کے
ہاتھ کا پلایا دودھ
اور سر کی مالش ضرور یاد آئے گی
پھر ایک روز تمہاری روح کام کے بوجھ
تلے دب جائے گی
اور تم اپنے خوابوں کی تکمیل کرتے کرتے
خود کو گم کر بیٹھو گے
گھر والے تمھیں بہت خلوص سے ہمارے
سپرد کر کے لوٹ جائیں گے
تمھاری قبر پہ تمھارا بیٹا پہلی عید پہ فاتحہ پڑھنے آئے گا
لیکن تب تک کتبے کے الفاظ اُڑ چکے ہوں گے
سرہانے کے پتھروں کی ترتیب بدل چکی ہو گی
وہ شاید کسی اور کی قبر پر پھول بکھیر کر
اور سیلفی بنا کر کیریئر بنانے لوٹ جائے گا

عمران شاہد

نثری نظم

درد کے سارے رستے بے حسی سے نکلتے ہیں
پرندے اب شجر پر
گھر نہیں بناتے
صبح پو پھوٹنے سے پہلے
شاخوں سے اڑ جاتے ہیں
کوئی اندھی گولی زندگی نگل نہ لے
انکی چہچہاہٹ میں ڈر سسکتا ہے
میں نے کوے کی آنکھ میں وحشت دیکھی ہے
چڑیا سہمی سہمی دیوار پر بیٹھی تھی
بلی شاید اسکو پرسہ دینے آئی ہے
اس نے بھی کل اپنا بچہ کھویا ہے
گاڑی کے ٹائر پر اب تک سوکھا خون لگا ہے
شہر میں کتا مار مہم چلی ہے
کہتے ہیں
کتے زیادہ ہو گئے تھے
غربت اور بھوک مٹانا کتنا آسان ہے بس زہر بھرا نوالہ کھلا دو
زندگی تلف ہو جائے گی

مرتے ہوئے اس آنکھ میں کتنا
درد چھپا تھا
درد کے سارے رستے
بے حسی سے نکلتے ہیں

نائلہ راٹھور

میں عورت ہوں، اور تھک چکی ہوں (نثری نظم)

روز صبح
چہرہ سجا کر،
ادھوری نیند،
ادھورے خواب
تکیے کے نیچے چھوڑ آتی ہوں۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے
پر اندر......
کوئی چیخ
دھیرے سے سانس لیتی ہے۔

یہ کپڑے، یہ چوڑیاں،
یہ خوشبوئیں...
یہ سب میں پہنتی ہوں
کہ شاید خود کو محسوس کر سکوں،
مگر اکثر......
خود کو بھول جاتی ہوں۔
لوگوں کی نظریں،
لفظوں کی چبھن،
توقعات کا بوجھ
اور خاموش ذمہ داریاں......
یہ سب میرے وجود کا حصہ بن چکی ہیں۔

کوئی پوچھتا نہیں
کہ میں کیسی ہوں،
میں کیوں خاموش ہوں،
میں کیوں ہر جواب پر سر ہلا دیتی ہوں؟

کبھی ماں،
کبھی بیٹی،
کبھی بیوی،
کبھی بہن بن کر...
میں خود کو کہیں کھو بیٹھی ہوں۔

میرے دل میں
ایک مسلسل دوڑ جاری ہے،
"کافی ہوں یا نہیں؟"
"درست ہوں یا نہیں؟"
"محفوظ ہوں یا نہیں؟"

یہ اینگزائٹی،
یہ بے چینی
میرے زیور کی طرح
میرے ساتھ جڑی ہے
بس......
دکھائی نہیں دیتی۔

لیکن آج
میں کہنا چاہتی ہوں:
میں تھک چکی ہوں۔
بس ایک لمحہ،
ایک سانس......
صرف اپنے لیے چاہتی ہوں

حنا بابر چوہدری

میں، تم اور حقیقت

[نثری نظم]

چلو مان لیتا ہوں
میرا تم سے کوئی تعلق نہیں
ایک لمحے کے لیے
خود کو دھوکا دینے میں کیا جاتا ہے
مان لیتا ہوں میرا تم سے کوئی تعلق نہیں
تھوڑی دیر کے لیے
ساری حقیقتوں کے دروازے
خود پر بند کر لیتا ہوں
تھوڑی دیر کے لیے مان لیتا ہوں
کل نہیں تھا آج نہیں ہے
کل کی تو ویسے بھی خبر نہیں
میں مان لیتا ہوں
صبح نہیں ہوتی
شام نہیں ہوتی
مان لیتا ہوں
روشنی نہیں اندھیرا نہیں
افق پر ابھرتا سورج جلوے نہیں دکھاتا
مان لیتا ہوں
فضا میں پھیلے
پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے
سورج کے غرور کو مٹا کر
افق پر دھنک کے رنگ نہیں بکھیرتے
مان لیتا ہوں
بادل نہیں ناچتے
بارش نہیں برستی
ہوا نہیں چلتی
پرندے نہیں اڑتے
خوشبو نہیں پھیلتی
مان لیتا ہوں رنگوں کے معجزے
روح کی گہرائیوں میں نہیں اترتے
مان لیتا ہوں
کائنات نہیں، کہکشائیں نہیں
کائنات اپنے ہونے کی گفتگو نہیں کرتی
ثقل بھی اپنا وجود نہیں رکھتی
اور مان لیتا ہوں
کائنات کا خالی وجود
موجود پر ثقل بن کر نہیں گرتا
یہ بھی مان لیتا ہوں
میں نہیں تم نہیں
زندگی نہیں محبت نہیں
اور ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں کوئی واسطہ نہیں
بس مجھے اتنا بتا دو میرے ہمدم
جب سب کچھ نہیں
تو میں تم سے یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں؟

محمد ازرم

شام

اور پھر گھنٹی بجی
اور لوگ اپنے بھاری بستے چھوڑ کر
دوسروں کے سوگ میں بے کل
گھروں سے چل پڑے
رنگ پھیکے پڑ گئے
راستوں پر سرمئی چھتری کھلی
گنگ بازاروں میں آوازوں کی بارش
اور مدھم ہو گئی
روشنی کم ہو گئی
نیکیوں کے بوجھ سے خالی
گنہ گاروں نے اپنی گٹھڑیاں
اپنے شانوں سے اُتاریں
اور زمیں کی کھینچ سے باہر گرے
جھنجھناتی عورتیں
اپنے لبالب برتنوں سے بے خبر
آنگنوں کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں
دل کے اندر شور کرتے قافلے چلنے لگے
اور دیے جلنے لگے

توصیف خواجہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاک داماں کیا ہوا؟ وہ حشر ساماں کیا ہوا؟
اے بیاباں! وہ غبارِ کوئے جاناں کیا ہوا؟

نظم

سرہانے پر پڑے
اک خواب کی تجسیم میں
جو وقت بیتے وہ محبت ہے!!

محبت رنگ نہ محلول ہے کوئی
کسی کے رنگ میں رنگ کر
کسی کی یاد میں گھل کر
تکلف برطرف کر کے
سمے کی چاپ سے اوپر
گھٹن کی راکھ سے اوپر۔۔۔

نشاطِ باہمی کی مدھ بھری جھنکار سن پاؤ
بہت تاریک راتوں میں دیئے کی لو بھی
گُل کر لو
کہ سلوٹ جسم کی بستر کو سونپو جب
کہانی میں چھپا ہر رمز اور اسرار سن پاؤ

کہیں انگلی کی پوروں میں مسکن لمس کی مانند
کسی شیریں سخن کے دہن میں
یا پھر آپ اپنے ذہن میں
آزاد و آسودہ
مگن در رقص و موسیقی
جیے جانا محبت ہے!!
پیے جانا محبت ہے!!

کشمالہ گیلانی

اپنی آواز کی ڈور کو توڑ دے

دھول میں اَٹ گئے ضابطے
خاک میں مِل گئے رابطے
انگلیوں پر کتنے غم نہیں بھولتے......
کیا کریں
شاخ سے پھول توڑیں ہتھیلی پہ رکھیں
تجھے یاد کرتے ہوئے بھول جائیں کہ ہم
کون ہیں
تو بتا، ہم سمندر کو آواز کو ڈور سے پار کیسے کریں
کیا کریں۔ چار سمتوں میں پھیلی اُداسی کو
کیسے سمیٹیں...... بتا
کس طرح اپنی تنہائی کو طے کریں
غم کی گٹھڑی کھلے تو محبت کے کنچے سمیٹیں
انھیں انگلیوں میں پکڑ کر
نئی روشنی اور نئے منظروں کو مخاطب کریں
دل سے باتیں کریں
دل جو اپنے سفر سے تھکا ہارا پہلو میں بیٹھا ہوا
رخصتی گا رہا ہے
کیا کریں...... آخر وقت ہے
تیری آواز کو ہم نے یقین مانا مگر جان نکلی نہیں
یہ سفر ختم ہو گا تو ہم جان لیں گے کہ تو نے
ہمارے لیے خیر مانگی
تب ہی تو ہمارا یہ برسوں پہ پھیلا سفر
اختتامی ہوا
تیری آواز کی ڈور کو تھام کر
تیری جانب بڑھیں...... کیا کریں
آخری وقت ہے
اپنی آواز کی ڈور کو توڑ دے

اعجاز رضوی

مکڑی کا جالا
افضل محمود

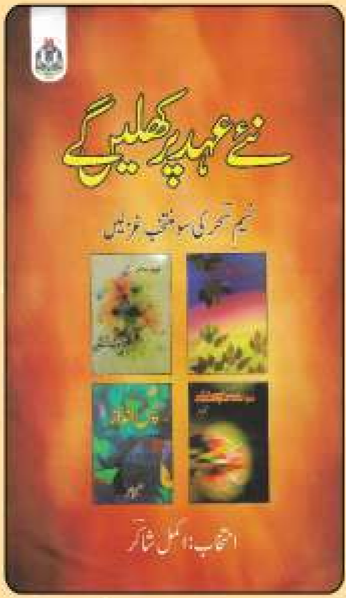
نئے عہد پر کھلیں گے
انتخاب: اکمل شاکر

جہانِ ابد
(اردو نظمیں)
راشد عباسی

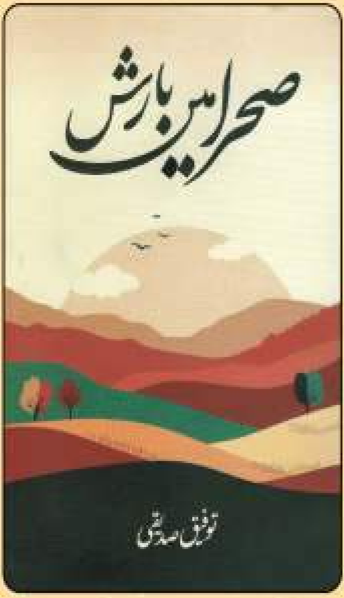
صحرا میں بارش
توفیق صدیقی